Regd. L. No. 7243

Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1967

سچے موتی

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا۔

جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا۔

(مسند امام احمد)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ادارۂ طلوع اسلام کی حیات افروز پیشکش

جہاد کیا ہے ــــــــ ؟
جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے ؟
مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں ــــــ قرآن کی رو سے قوانین جنگ کیا ہیں ــــــ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔
ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔
بصیرت افروز۔ حیات آموز۔
قیمت صرف ــــــ دو روپے فی جلد

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

پاکستان کا معمارِ اول

سید کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا مقام بلند ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ اس مختصر لیکن نہایت جامع کتاب میں سرسید کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ بڑی پُر از معلومات کتاب ہے۔ قیمت صرف۔ تین روپے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
۸۰۸۰۰	پاکستان ۔ ایک روپیہ	سالانہ — پاکستان — دس روپے
خط و کتابت	ہندوستان ۔ ڈیڑھ روپیہ	سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام		سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ
۲۵۔ بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور		

نمبر (۱۱)	نومبر ۔ (۱۹۶۷ء)	جلد (۲۰)

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲
(۲) قائدِ اعظم کا تصورِ پاکستان ——— (پرویز صاحب) ——— ۹
(۳) تصورِ پاکستان اور علماء ۔ زنّار پوش ——— (چوہدری حبیب احمد صاحب) ——— ۱۹
(۴) رابطۂ باہمی ——— ۳۹
(۵) اسرائیل کا عالمی کردار ——— (خورشید عالم صاحب) ——— ۴۱
(۶) پاکستان کا معمارِ اول ——— ۴۹
(۷) حقائق و عبر (اسلام کا تصور ۔ مشینی ذبیحہ) ——— ۵۳
(۸) مطالب الفرقان ——— ۵۷
(۹) طلوعِ اسلام کنونشن کا پروگرام ——— ۷۹-۸۰

(ایڈیٹر محمد لطیف) (ناشر سراج الحق) (مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ لاہور) (پرنٹر شیخ محمد اشرف) (مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی' کے ترجمان' ماہنامہ فکرونظر کی اکتوبر ۱۹۶۷ء کے افتتاحیہ میں ایک ایسی بحث چھیڑی گئی ہے جو ملک کے اسلام دوست اربابِ بصیرت کو دعوتِ فکروتدبر دیتی ہے۔ یہ بحث' اس مجلہ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:۔

"پاکستان ایک قومی مملکت ہے۔ اور قومی ہونے کے ساتھ وہ ایک اسلامی مملکت بھی ہے۔ اسی طرح آج دنیا میں مسلمانوں کی بہت سی قومی مملکتیں ہیں' جن کی اساس ان مسلمانوں کی اپنی مخصوص قومیتیں ہیں۔ اب اگر قومیت منافی ہے اسلام کے' تو اس سے یہ حتماً لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک قومی مملکت' اسلامی نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح ضروری ہے کہ ان کی ایک اسلامی مملکت بھی قومی مملکت کی نقیض مانی جائے۔ یاد رہے کہ یہ مسئلہ نفسِ مملکت کے بارے میں ہے اور اس میں زیرِ بحث بات صرف یہ ہے کہ آیا مسلمانوں کی قومی مملکتیں اسلامی ہونے کا استحقاق رکھتی ہیں یا نہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ کسی مسلمان مملکت کا کس طرح کا آئین ہو اور اس میں کیسے قوانین وضوابط نافذ کئے جائیں' تو اس میں بحث کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ اور ان مملکتوں کی رائے عامہ ان کی تشکیل وترتیب میں برابر اثر انداز ہوتی رہے گی آئین اور قوانین وضوابط بہرحال ایک معین زمان ومکان میں ترتیب پاتے ہیں۔ اور چونکہ زمان ومکان میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں' اس لئے ایک اسلامی مملکت کے آئین اور قوانین وضوابط کا کسی قسم کے تغیر وتبدل سے ماوراء ہونا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ مثال کے طور پر اتاترک کے انقلاب کے بعد ترکی کا آئین سیکولر بنا دیا گیا' لیکن ترکوں کے لئے اس امر میں مطلقاً کوئی مانع نہیں کہ کل کو اگر وہ چاہیں تو اپنے آئین کی اس نوعیت کو تبدیل کردیں اور اسے کوئی دوسری شکل دے دیں۔ ایک مسلمان قوم جو خود مختار ہے

اور اپنی تقدیر کی خود مالک ہے، اُسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے آئین بنائے اور نظم و نسق حکومت کے لئے قوانین و ضوابط وضع کرے۔ اس میں غلطیاں ہو سکتی ہیں جن کی اصلاح کا دروازہ بے شک ہمیشہ کھلا رہنا چاہئے۔ لیکن مسلمانوں کی ایک قومی مملکت جس میں وہاں کے مسلمان عوام پوری آزادی سے اپنی رائے کے اظہار کا حق رکھتے ہوں، اُسے اس بنا پر اسلامی ماننے سے انکار کرنا کہ وہاں کا آئین یوں نہیں، یوں ہے اور اس میں اس طرح کے قوانین و ضوابط رائج ہیں صحیح نہیں۔

مسلمانوں کی قومی مملکتیں اس دَور کا ایک تاریخی تقاضا ہیں اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد ان کا وجود پذیر ہونا ممکن ہو سکا ہے۔ آج کی دنیا میں جو معاشی و سیاسی قوتیں برسرِ کار ہیں، اور پچھلی ایک دو صدیوں میں بین الاقوامی حالات و واقعات کی جو روش رہی ہے، ان سب کا مجموعی نتیجہ نہ صرف عالمِ اسلام کا بلکہ باقی دنیا کا بھی مختلف قومی مملکتوں میں منقسم ہونا ہے۔"

اس بحث میں دو اہم سوال اٹھائے گئے ہیں۔ یعنی

(۱) ایک قومی مملکت، قومی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہو سکتی ہے یا نہیں ــ اور

(۲) ایک اسلامی مملکت کے آئین و ضوابط قابلِ تغیر و تبدل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

چونکہ دوسرا سوال اس لحاظ سے اساسی و بنیادی ہے کہ یہی اس حقیقت کے پرکھنے کا معیار ہے کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں، اور ایک مملکت فی الواقعہ اسلامی ہے یا نہیں۔ اس لئے ہم پہلے اسی کو لیتے ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے، اسلامی اور غیر اسلامی مملکت کا خطِ امتیاز یہ ہے کہ :-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو خدا کی نازل کردہ (کتاب) کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، تو یہی لوگ کافر ہیں۔

لہٰذا، اگر کوئی مملکت، آئینی طور پر اس کا فیصلہ اور اعلان کر دے کہ اس کے آئین و ضوابط قرآنِ کریم کے تابع ہوں گے، تو وہ مملکت اسلامی کہلائے گی۔ قرآنِ کریم میں کچھ تو متعین احکام و قوانین ہیں اور باقی اصولی ہدایات ہیں۔ قرآن کے اصول ہوں یا احکام و قوانین، یہ سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل، یا حک و اضافہ کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ لیکن جہاں تک ان اصولوں کی جزئیات کا تعلق ہے، وہ ہر زمانے کی مملکت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق، خود مرتب کرے گی۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان کی حدود کے اندر مرتب کردہ قوانین و ضوابط قابلِ تغیر و تبدل ہوں گے۔ اسلامی مملکت کا ضابطۂ آئین و قوانین، اسی ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے ترتیب پائے گا۔ اس سے واضح ہے کہ مجلۂ فکر و نظر کے افتتاحیہ کا وہ حصہ جس میں آئین و ضوابط سے متعلق بحث کی گئی ہے نہ

صرف غلط فہمی بلکہ بہت بڑی گمراہی پیدا کرنے کا موجب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ

> ایک مسلمان قوم جو خود مختار ہے اور اپنی تقدیر کی خود مالک ہے اسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے آئین بنائے اور نظم و نسق حکومت کے لئے قوانین وضوابط وضع کرے۔

لیکن ــــ اور اسی لیکن سے کفر و اسلام کی تمیز ہوتی ہے ــــ اس مسلمان قوم کا یہ حق غیر محدود نہیں۔ وہ قرآنِ کریم کے ابدی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے اس حق کو استعمال کر سکتی ہے۔ اگر اس مملکت کو بلا حدود و قیود قانون سازی کا حق دے دیا جائے تو اس میں اور ایک سیکولر اسٹیٹ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایسی مملکت کو اسلامی تسلیم کرنا یکسر غیر اسلامی ہے۔ چونکہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی' آئینِ پاکستان کے تابع وجود میں لایا گیا ہے، اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ایک طرح خود حکومت کے ترجمان کی سی ہے' اس لئے اسے اسلام کے اس قسم کے اساسی امور سے متعلق بات کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس افتتاحیہ میں آگے چل کر' ادارہ کے ڈائریکٹر' ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی ایک تقریر کا یہ فقرہ بھی سامنے آتا ہے کہ،

> ہماری وہ قدریں جو ہمارے دین سے پھوٹتی ہیں' ابدی ہیں۔ اور ہمیں اپنی سیاسی اقتصادی اور اجتماعی زندگی میں ان سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

لیکن جو کچھ افتتاحیہ کے شروع میں تفصیل سے کہا گیا ہے (اور جس کا اقتباس) ہم نے اوپر درج کیا ہے) وہ بڑا گمراہ کن ہے۔ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی تقریر کا یہ فقرہ ان باطل تاثرات کو مٹا نہیں سکتا جو اس (افتتاحیہ) سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا یہ مؤقر ہمعصر' اسلامی مملکت کے حقِ قانون سازی کے متعلق وضاحت سے بات کر کے' ان گمراہ کن تاثرات کا ازالہ کر دے گا۔

اس کے بعد ہم اس بحث کے دوسرے گوشے کو سامنے لاتے ہیں یعنی اس گوشے کو کہ کیا ایک قومی مملکت' قومی ہونے کے باوجود اسلامی ہو سکتی ہے؟

قرآنِ کریم کا مطمحِ نگاہ یہ ہے کہ انسانوں کے خود وضع کردہ اختلافات و امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسان کی ایک عالمگیر برادری بنا دی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے' اس نے' رنگ' نسل زبان' وطن کے امتیازات سے بلند ہو کر محض آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی بنا پر ایک امت کی

تشکیل کی۔ یاد رکھیے۔ اس امت کی بعثت، انسانوں میں مزید تفرقہ پیدا کرنے کے لئے ایک گروہ بندانہ منصوبہ کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس سے مقصد، ان تفرقوں کو مٹا کر، عالمگیر وحدتِ انسانیت کی طرف عملاً قدم اٹھانا تھا۔ اس امت نے قرآن کی بنیادوں پر ایک مملکت قائم کی — واضح رہے کہ اسلام، امتِ مسلمہ اور اسلامی مملکت، لازم و ملزوم ہیں — پروگرام یہ تھا کہ یہ امت انسانوں کے مختلف گروہوں کو اپنے آغوش میں لیتی ہوئی آگے بڑھتی اور اس طرح حدود فراموش ہوتی چلی جاتے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد (ان موانع کی وجہ سے، جن کے تذکرہ کا یہ مقام نہیں) اس پروگرام کی ترقی رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی، اس امت میں، دین کی جگہ مذہب نے لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اس امت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ "مذہبی سطح" پر یہ مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور سیاسی سطح پر، اس کی مملکت بھی مختلف حدود میں تقسیم ہو گئی۔ یہی ہیں اسلامی مملکتِ واحدہ کے وہ ٹکڑے جنہیں اس وقت مسلمانوں کی قومی مملکتیں کہا جاتا ہے۔ اس وقت یہ "مسلمانوں کی قومی مملکتیں" ہیں، اسلامی مملکتیں نہیں۔ سوال یہ ہے کہ:

(۱) کیا یہ مملکتیں دوبارہ اسلامی بن سکتی ہیں — اور

(۲) کیا یہ اسلامی بننے کے بعد، اپنی موجودہ محدودیت کے لحاظ سے قومی بھی رہ سکتی ہیں؟

جہاں تک ان کے اسلامی بننے کا تعلق ہے اس میں ذرا سی بھی دشواری نہیں۔ جیسا کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں، جب بھی کوئی مملکت اس امر کا (آئینی طور پر) فیصلہ اور اعلان کر دے کہ اس کا کاروبارِ مملکت، قرآن کریم کی متعین کردہ ابدی حدود کے تابع رہے گا، تو اس سے وہ مملکت اسلامی کہلا سکتی ہے۔ اب رہا یہ سوال، کہ اگر کوئی مملکت اس طرح اسلامی بن جائے، تو کیا اس کے بعد وہ قومی بھی رہ سکتی ہے؟ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں "قومی" سے مراد یہ ہے کہ ان کا موجودہ الگ الگ تشخص (SEPARATE IDENTITY) باقی رہے۔ مثلاً اس وقت ایران کی حدود میں قائم شدہ مملکت ایرانی کہلاتی ہے۔ اور افغانستان کی حدود میں قائم شدہ مملکت، افغانی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ مملکتیں اپنے ہاں قرآنی آئین نافذ کر لیں، تو کیا اس کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ وہ ایرانی اور افغانی بھی رہ سکیں؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام نے ایک امت کی تشکیل کی تھی جو امتِ واحدہ تھی۔ اور اس امت نے ایک مملکت قائم کی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مملکت بھی واحدہ تھی۔ اسلام کا مطمحِ نگاہ تو یہی ہے کہ ایک امت اور اس کی ایک مملکت۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے جو

حالات اس وقت ہیں، ان کے پیشِ نظر اس نصب العین کو دوبارہ کس طرح حاصل کیا جائے؟
ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی موجودہ مملکتیں، اپنے ہاں اسلامی نظام رائج کرلیں، تو ان کے الگ الگ تشخص کا قائم رہنا، اُن کے اسلامی ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوگا۔ یہ حالات موجودہ، ایرانی، افغانی، ترکی، مصری (وغیرہ) مملکتیں، اپنے اس تشخص کو قائم رکھتے ہوئے بھی اسلامی ہوسکتی ہیں۔

لیکن آپ دیکھئے کہ جب ان کے اسلامی ہونے کی شرط یہ ہے کہ اُن کا آئین قرآنی ہوگا اور ان کا کاروبارِ مملکت قرآن کی حدود کے اندر، سرانجام پائے گا، تو (ان کے موجودہ تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے بھی) ان میں کس قدر موافقت اور یک جہتی پیدا ہوجائے گی۔ یہ تو ممکن ہوگا کہ قرآنی اصولوں کے تابع جو جزئی قوانین (مثلاً) پاکستان مرتب کرے، وہ ان قوانین سے کچھ مختلف ہوں جنہیں مصری حکومت (اپنے مقامی حالات کے مطابق) اپنے ہاں رائج کرے، لیکن اصولی طور پر ان حکومتوں میں جس قدر یک رنگی اور ہم آہنگی ہوگی، اس کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ ۔۔ یہ دنیا میں دولِ مشترکہ (COMMON WEALTH) کا ایک نیا تجربہ ہوگا کہ مختلف مملکتوں کا آئین ایک ہو اور وہ اصول بھی ایک جن کے تابع وہ جزئی قوانین مرتب کریں۔ اس اشتراک کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی مملکت، کسی دوسری مملکت کے خلاف تلوار نہیں اٹھاسکے گی۔ کیونکہ قتلِ مومن بالارادہ، قرآن کی رو سے، جرمِ عظیم ہے۔ جو قاتل کو جہنم کی سزا کا مستوجب بنا دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو غیر اسلامی مملکت، ان میں سے کسی ایک کی دشمن ہوگی، وہ ان سب کی دشمن تصوّر ہوگی۔ بالفاظ دیگر ان تمام (اسلامی) مملکتوں کی خارجہ پالیسی اور دفاع واحد ہوگی۔ ان میں وسائلِ رسل و رسائل کا اشتراک ہوگا۔ آمد و رفت کے موانع ختم ہوجائیں گے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ان سب کی کرنسی بھی مشترک ہوجائے۔ ان کا اپنا ایک مرکزی ادارہ ہوگا جو ان سب میں باہمی تعاون و تناصر (LIAISON) کے فرائض سرانجام دے گا۔ اس بے حجابانہ قرب کے نتائج ایسے خوشگوار ہونگے کہ (امید کی جاسکتی ہے کہ) کچھ عرصہ کے بعد، بلاکسی خارجی دباؤ کے، یہ مملکتیں ایک ایسی کانفیڈریسی قائم کرلیں جس کا مرکز ان کے نمائندگان پر مشتمل ہو۔ اور خارجہ پالیسی، دفاع، کرنسی، مواصلات وغیرہ شعبے اس مرکز کے کنٹرول میں دے دیئے جائیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ متفرق ٹکڑے وحدت سے قریب تر ہوتے چلے جائینگے۔

یہ ہے ہماری بصیرت کے مطابق، وہ طریق جس سے مسلمانوں کی موجودہ قومی مملکتیں، اسلامی

ہونے کے بعد بھی اپنے جداگانہ تشخص کو باقی رکھ سکیں گی۔ یہ اس سلسلہ میں پہلا قدم ہوگا۔ اس کے بعد حالات اور تقاضے انہیں خود بخود قریب سے قریب تر کرتے جائیں گے۔ یہ درحقیقت وہی طریق کار ہوگا جس کے مطابق قرآن کریم نے، شعوب و قبائل کو لِتَعَارَفُوا (بغرض تعارف) باقی رہنے دیئے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس کے بعد جب امت کی وحدت زیادہ مستحکم ہوگئی تو پھر یہ شعوب و قبائل خود بخود اس وحدت میں گم ہوگئے تھے۔

لیکن اگر "قومی مملکت" سے مراد یہ ہے کہ ایک مملکت کے اندر بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تصور کرلیا جائے، اور اس طرح اس مملکت کو قومی قرار دیا جائے۔ تو اس قسم کی مملکت، قومی تو ہوسکتی ہے، اسلامی نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ قرآن کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ تشکیل امت (قومیت) کا مدار آئیڈیالوجی (ایمان) کا اشتراک ہے، نہ کہ وطن یا نسل کا اشتراک۔ اگر وطن یا نسل کا اشتراک معیار قومیت ہوتا تو ابولہب اور محمدؐ ایک ہی قوم کے افراد ہوتے۔ اسلام نے جن افراد کو ہم رنگ بنا کر ایک قوم کی تشکیل کی تھی وہ اسی ملک کے رہنے والے اور وہاں کے غیر مسلموں کے ہم نسل تھے۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کی قومیت الگ الگ تھی۔ اسلامی مملکت اس نئی قوم پر مشتمل افراد کی مملکت تھی، مسلم اور غیر مسلم اہل عرب کی قومی مملکت نہیں تھی۔ اسلام کا یہی وہ ابدی اصول تھا جو ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھا، اور یہی وہ نظریہ تھا جو نظریۂ پاکستان کے حامیوں اور نیشنلسٹ علماء میں مابہ النزاع تھا۔ نیشنلسٹ علماء کا موقف یہ تھا کہ:

"قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔"

(حسین احمد مدنی۔ مرحوم)

لیکن نظریۂ پاکستان کے حامی کہتے تھے کہ یہ غلط ہے۔

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (اقبالؒ)

یہی تھی وہ ازلی حقیقت جسے پیش کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ پاکستان کا مطالبہ ہندوستان کے مسلمانوں کا نیا مطالبہ نہیں۔

پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جس دن (یہاں) سب سے پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے وطن نہیں

> ذہنی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔
>
> (مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ مؤرخہ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء)

وہ مسلمان، مسلمانوں کی جداگانہ قوم کی پہلی اینٹ تھا۔ لہٰذا، اسلامی قومی مملکت وہی ہو گی جس میں قوم سے مراد وہاں کی مسلم آبادی ہو گی نہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ آبادی۔ ہمیں امید ہے کہ مجلہ فکر و نظر اپنی کسی آئندہ اشاعت میں اس کی بھی وضاحت کر دے گا۔ یہ ایسے امور ہیں جن کے متعلق کبھی مبہم بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے محترم (سابق چیف جسٹس) محمد منیر صاحب کا مقالہ آیا جو پاکستان ٹائمز کی ۳۰ اکتوبر کی اشاعت میں۔۔۔ ایامِ گذشتہ کی یاد۔۔۔ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے (اور ایسا انہوں نے پہلی بار نہیں کیا وہ اس سے پہلے بھی ایسا کچھ کر چکے ہیں) کہ مملکتِ پاکستان نہ اسلام کی بنیادوں پر وجود میں لائی گئی تھی اور نہ ہی یہاں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک تھا۔ اسے ایک سیکولر اسٹیٹ بنایا جانا مقصود تھا جس میں بسنے والے مسلم و غیر مسلم سب ایک قوم کے افراد متصور کئے جائیں۔ اگر جسٹس موصوف ان باتوں کو اپنے خیالات کے طور پر پیش کرتے تو بات اور تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ خود اُن کا منشاء اور مقصود بھی یہی تھا۔ اسوقت عدمِ گنجائش مانع ہے کہ ہم اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کر سکیں۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اسوقت ہم صرف جسٹس موصوف کے اپنے پیش کردہ اصول کو معیار قرار دے کر چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس حقیقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ "متضاد باتیں کہنا، منافقت برتنا، سیاسی ہتھکنڈے اختیار کرنا یا سستی شہرت حاصل کرنے کا جذبہ، قائداعظمؒ کے کردار سے بہت دور تھا۔" ہم اسی اصول کو معیار قرار دیتے ہوئے جسٹس موصوف کی توجہ قائداعظمؒ کے ان ارشادات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو چند صفحات آگے پرویز صاحب نے اپنی تقریر میں پیش کئے ہیں اور قومیت کے متعلق ان کی ایک تقریر کے اس اقتباس کی طرف جو اوپر درج کیا گیا ہے۔ کیا قائداعظمؒ کے ان ارشادات کی موجودگی میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو جو کچھ کہا تھا اس سے وہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جو جسٹس موصوف نے نکالا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اسے بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ قائداعظمؒ جو کچھ تحریکِ پاکستان کے دوران مسلسل اور پیہم کہتے رہے حصولِ پاکستان کے بعد اس سے صاف پھر گئے۔ کیا یہی ہے قائداعظمؒ کا وہ کردار جسے جسٹس موصوف دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں؟ اسوقت ہم انہی اشارات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ تفصیلی گفتگو کسی دوسرے وقت سہی۔

قائدِ اعظمؒ کا تصوّرِ پاکستان

> ۱۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کو پاکستان کلچرل کونسل کے زیرِ اہتمام پی۔ این۔ آر سنٹر (لاہور) میں قائدِ اعظم کی برسی کی تقریب پر پرویز صاحب نے عنوان بالا پر ایک برجستہ تقریر کی جسے بعد میں (نوٹس کی مدد سے) مرتب کیا گیا اب اسے بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ پیشِ خدمتِ قارئین کیا جاتا ہے۔
> (طلوعِ اسلام)

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز!

میں نے قائدِ اعظمؒ کی برسی ہی کی ایک تقریب پر کہا تھا کہ کیا اس قسم کی کہانی وجہ تعجب نہیں ہوگی کہ ایک شخص نے ایک چیز حاصل کرنے میں برسوں تگ و تاز کی۔ اس سلسلہ میں اس نے اپنے اوپر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کرلی۔ اس راستے میں جس قدر تکالیف آئیں، انہیں ہمت اور استقلال سے برداشت کیا۔ اور مدافعت کرکے، سالہا سال کی محنت اور مشقت کے بعد، وہ گوہرِ مقصود ہاتھ لگ گیا۔ لیکن جب اسے وہ چیز حاصل ہوگئی تو وہ سوچنے بیٹھ گیا کہ میں نے اسے کیوں حاصل کیا؟ اس سے میرا مقصد کیا تھا اور اس کا مصرف کیا ہے؟

یہ کہانی یقیناً ہر ایک کے لئے باعثِ تعجب ہوگی لیکن یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتے گا جب یہ حقیقت سامنے آئے کہ یہ کہانی کسی غیر کی نہیں۔ یہ خود ہماری اپنی کہانی ہے۔ میری اور آپ کی کہانی ہے۔ جملہ اہلِ پاکستان کی کہانی ہے۔

ہم نے پاکستان کے حصول کے لئے برسوں تک مسلسل جدوجہد کی۔ اس مطالبہ کی ہر طرف سے مخالفت ہوئی لیکن ہم نے اس مخالفت کا بڑی جانفشانی سے مقابلہ کیا۔ اس کی راہ میں جو موانعات آئے، انہیں بڑی اولوالعزمی سے دور کیا۔ للہ الحمد کہ ہماری برسوں کی مساعی مشکور ہوئیں۔ اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان

معرضِ وجود میں آگیا۔ لیکن جب پاکستان حاصل ہوگیا تو ہم سوچنے بیٹھ گئے کہ ہم نے اسے کیوں مانگا تھا؟ ہمارے اس مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ ہمیں ایک الگ مملکت کی تشکیل کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ بیس برس سے ہمارے سامنے یہ سوالات آرہے ہیں اور ان کے جواب میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان کا وجود، ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ وہ اگر مسلمانوں سے کشادہ ظرفی سے پیش آتا تو ان کی طرف سے یہ مطالبہ کبھی نہ کیا جاتا۔ دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ میاں! یہ تو انگریز کی اسکیم تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان سے جائے تو اسے اس حالت میں چھوڑ جائے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مسلسل نزاع رہے۔ اسی تفرقہ میں اس کا فائدہ تھا۔ جناح تو انگریز کا آلۂ کار تھا۔ نوجوان طبقہ سے جب یہ کہا جائے کہ اس کی بنیاد مذہب پر تھی تو وہ ایک خندۂ استہزاء کے ساتھ کہتا ہے کہ مذہب کو ان امور سے کیا واسطہ؟ پاکستان کا جذبۂ محرکہ خالص سیاسی اور معاشی تھا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کی قوم مذہب پرست واقع ہوئی ہے اس لئے اسے مذہب ہی کے نام پر اپیل کی جاسکتی تھی ـــــ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ ہے پریشانیٔ فکر و نظر کا وہ عالم جس میں قوم بیس سال سے وقفِ اضطراب ہے۔ ہم نے ان سوالات کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ کہا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنی طرف سے ان کا جواب دیں، ہم کیوں نہ خود ان سے پوچھ لیں جنہوں نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا تھا کہ اس سے ان کا مقصود کیا تھا۔ میں اس ضمن میں اس سے پہلے بھی بہت کچھ کہہ چکا ہوں اور آج کی نشست میں انہی میں سے کچھ باتیں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ جب تک یہ مسئلہ قوم کے ذہن میں صاف نہیں ہو جاتا، ان باتوں کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ اسلام اور صرف اسلام کا تقاضا تھا۔ باقی تمام امور ثانوی اور ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اس حقیقت کے سمجھنے میں جو دشواری پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک مذہب اور دین میں فرق نہیں کر پاتے اور اسلام کو بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب سمجھتے ہیں۔ مذہب سے مفہوم ہوتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق جو مختلف رسومات، اور پرستش سے قائم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انفرادی تجربہ کا نام ہے جسے نہ امورِ دنیا سے کوئی تعلق ہوتا ہے، نہ انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی واسطہ۔ اگر اسلام واقعی ایک مذہب ہے تو پھر یہ اعتراض واقعی بڑا وزنی ہے کہ مذہب کو ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ سے کیا واسطہ! اور اسی مفروضہ سے لازمی طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس مطالبہ کا حقیقی جذبہ سیاسی اور معاشی تھا اور مذہب کو بطور ایک نقاب یا بعض نوجوانوں کی اصطلاح میں "بطور وکیلانہ حربہ" استعمال کیا گیا تھا۔

لیکن اسلام، مذہب نہیں دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں وہ ضابطۂ خداوندی جس کے مطابق دنیاوی زندگی بسر کی جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک خاص ضابطۂ قوانین کے مطابق زندگی اسی صورت میں بسر کی جا سکتی ہے جب اس ضابطے کے نفاذ کے لئے اپنی آزاد مملکت ہو۔ ہندوستان میں سوائے چند ایک کے، جن کے نام انگلیوں پر گنے جاتے ہیں، تمام علماء نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جب (انگریز کے چلے جانے کے بعد) اہلِ ہند کی اپنی حکومت ہوگی تو اس میں مسلمانوں (اور دیگر تمام اہلِ مذاہب) کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اسلئے اس مملکت میں اسلام کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ لہٰذا مذہب کی بنا پر، الگ مملکت کا مطالبہ، اسلام کا تقاضا نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی بنیادوں پر ایک جداگانہ مملکت کا تصور علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ اس لئے علماء کی طرف سے اس اعتراض کا جواب انہی کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ اور وہ جواب یہی تھا، کہ اسلام، ایک دین ہے، اور دین اسی صورت میں ایک زندہ حقیقت بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ چنانچہ انہوں نے، اپنی زندگی کے آخری دنوں (بلکہ یوں کہئے کہ بسترِ مرگ سے) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے نظریۂ قومیت کے خلاف جو بیان دیا تھا، اس میں انہوں نے اسی حقیقت کو واشگاف کیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو، ہندوؤں سے الگ قوم نہ سمجھا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نظریہ ہوگا کہ

> مذہب اور سیاست دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔

نیشنلسٹ علماء کے اس موقف کو حضرت علامہؒ نے ایک شعر میں سمو کر سمجھا دیا تھا جب فرمایا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

لہٰذا یہ ساری کشمکش، مذہب اور دین کے فرق کو نہ سمجھنے کا نتیجہ تھی۔ اس سلسلہ میں، میں برادرانِ عزیز! تھوڑی سی گریز کی اجازت چاہتا ہوں۔ قائداعظمؒ کی یاد کی تقریب میں، صیغۂ متکلم کا استعمال مناسب نہیں معلوم ہوتا، لیکن اس وقت اس کا ذکر ناگزیر ہو گیا ہے جس کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ حضرت علامہؒ کی وفات کے بعد، دین اور مذہب کے اس فرق کو نمایاں کرنے کی سعادت اس ہیچ میرز کے حصہ میں آئی تھی۔ اور طلوعِ اسلام کے اجراء سے یہی مقصود تھا۔ چنانچہ اگر آپ یہ دیکھنا چاہیں کہ علمائے کرام کے ساتھ یہ بحث کس قدر شدت اختیار کر گئی تھی تو آپ اس دور کے طلوعِ اسلام کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ یہی تھا مذہب اور دین کا وہ بنیادی فرق جسے قائداعظمؒ اپنی تقریروں اور تحریروں میں مسلموں اور غیرمسلموں

کے سامنے پیش کرتے رہے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ہم جو مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کرتے ہیں، تو اس کی اساس و بنیاد کیا ہے۔ میں، اس وقت، ان کی ان تحریروں اور تقریروں سے کچھ اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

قائد اعظم نے مارچ ۱۹۴۰ء میں، لاہور کے تاریخی اجلاس میں، جس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا، اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا۔

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دیگا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

انہوں نے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے (کہ اسلام ایک معاشرتی نظام ہے) نومبر ۱۹۴۵ء میں ایڈورڈز کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ۔

> ہم دونوں قوموں میں صرف "مذہب" کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ انہوں نے یہ کہہ کر کہ "دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے" دین اور مذہب کے فرق کو کس طرح نمایاں کر دیا ہے۔ پھر انہوں نے انہی دنوں فرنٹیئر مسلم لیگ (پشاور) کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشو و نما، روایات، اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

انہوں نے اس سے پہلے جون ۱۹۴۵ء میں فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں کہا،

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل ہی نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طالبعلموں نے آپ سے نظریہ پاکستان کے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ وہ سوالات، اور قائداعظمؒ کی طرف سے اُن کے جوابات اس قابل ہیں کہ انہیں بڑی توجہ سے سنا اور سمجھا جائے کیونکہ وہ اس باب میں گویا قولِ فیصل کا حکم رکھتے ہیں۔ آپ بھی انہیں غور سے سنئے :۔

سوال :۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب :۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

سوال :۔ اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :۔ اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

اب اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے، جو میرے نزدیک اس موضوع پر متعلقہ جگہ

غور سے سنیئے:-

سوال:- اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:- "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قائداعظمؒ نے چند لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ دین کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ اطاعت، خدا کے علاوہ اور کسی کی نہیں، لیکن خدا تو ایک غیر مرئی ہستی ہے۔ اس کی اطاعت کس طرح کی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی اطاعت سے مقصود اس کی کتاب کے احکام و قوانین کی اطاعت ہے۔ اور اسلامی مملکت، درحقیقت انہی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے۔

قائداعظمؒ کو، قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت پر کس قدر یقین محکم تھا، اس کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً انہوں نے، ۱۹۴۵ء میں، قوم کے نام عید کے پیغام میں فرمایا۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ:-

"بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن، مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حاجات کا مسئلہ

ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطے میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:

وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کردی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ:

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت!

قائداعظمؒ نے اس حقیقت کو اس قدر اصرار و تکرار کے ساتھ دہرایا تھا کہ "اور تو اور" ہندو بھی اس باب میں کسی شبہ میں نہیں رہے تھے۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۹۴۶ء کو لدھیانہ میں، اکھنڈ بھارت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مشہور بھارتی راہنما مسٹر منشی نے کہا تھا کہ

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مواطن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹریبیون۔ ۲ نومبر ۱۹۴۶ء)

میں برادرانِ عزیز! اس سلسلہ میں اتنی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآنی اصولوں کے مطابق جو مملکت وجود میں آئے گی اس کا نقشہ وہ ہوگا جو محمدؐ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے سرزمین حجاز میں متشکل ہوا تھا۔

یہ تو حصولِ پاکستان سے پہلے کی روئیداد ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی، قائداعظمؒ اسی نظریہ اور مقصد کو دہراتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں، خالق دینا ہال (کراچی) میں، عمال حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

اسلام کے "عدلِ عمرانی" سے کیا مراد ہے، اس کی تشریح میں ذرا آگے چل کر کروں گا۔ جہاں تک مملکتِ پاکستان کے آئین کا تعلق ہے، قائداعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کیا تھا اس میں انہوں نے کہا تھا۔

پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عاید ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

جہاں تک پاکستان کے معاشی نظام کا تعلق ہے، انہوں نے ۱۹۴۳ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں، برملا اعلان فرمایا تھا کہ:

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک

ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں، خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

اور تشکیلِ پاکستان کے بعد، انہوں نے (اپنی زندگی کی غالباً آخری تقریر میں) اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے (جولائی ۱۹۴۸ء میں) فرمایا تھا۔

ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا۔ اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

یہ تھا عزیزانِ من! خود قائداعظمؒ کے الفاظ میں، پاکستان کا نظریہ، اور وہ مقصد جس کے لئے اس الگ، آزاد، مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ ان تصریحات کے بعد کیا اس سوال کے اٹھانے کی ضرورت یا گنجائش رہ جاتی ہے کہ مطالبہ پاکستان کا جذبہ محرکہ کیا تھا اور اس مملکت کے قیام سے مقصود و مطلوب کیا؟ اور کیا اس سوال کے جواب میں دو آراء بھی ہو سکتی ہیں؟ جو لوگ تحریک پاکستان کے

معنی شاہد ہیں یا جنہوں نے اس سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر وہ اس قسم کے سوالات عام کریں یا شبہات ابھاریں، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملک میں خواہ مخواہ پاکستان کے متعلق ذہنی انتشار پیدا کیا جائے۔ لیکن ہماری نئی پود کی طرف سے جو اس قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں، تو اس کے لئے وہ قصوروار نہیں، قصوروار ہم ہیں جنہوں نے اس قسم کا انتظام ہی نہیں کیا کہ انہیں بتایا جائے کہ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے۔ اسلام کا نظریہ کیا تھا اور اس کا حصول کس طرح ہمارا دینی تقاضا تھا، اور اسی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے قائداعظمؒ نے اس کے لئے اس قدر کد و کاوش کی تھی۔ کس قدر مقام تاسف ہے کہ اسوقت تک نہ تو تحریک پاکستان سے متعلق کوئی ایسی مستند کتاب شائع ہوئی ہے جس میں نظریۂ پاکستان کی وضاحت کی گئی ہو اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی سوانح حیات ایسی ہے جسے اس نقطۂ نگاہ سے لکھا گیا ہو۔ باقی رہیں ہماری تعلیم گاہیں، تو ان کا خدا حافظ ہے۔ ان میں اسلام کا نام تو بہت کچھ لیا جاتا ہے لیکن اسلام کے متعلق بتایا کچھ نہیں جاتا۔ اور جو بتایا جاتا ہے اس سے طلباء کے دل میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کے خلاف اور شکوک ابھرتے ہیں۔

یہ شکوک ہمارے نوجوانوں کو کس مقام تک پہنچا دیتے ہیں اس کا اندازہ ایک خط سے لگائیے جو ۱۲ جولائی ۱۹۶۷ء کے پاکستان ٹائمز میں، ایک نوجوان 'کیڈٹ' سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ:

"پاکستان کی تشکیل کا اصلی مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا ... تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔"

ذرا غور کیجئے کہ (نظریۂ پاکستان تو ایک طرف رہا) اس سے خود قائداعظمؒ کی کس قسم کی سیرت سامنے آتی ہے۔ عجیب حسن اتفاق تھا کہ انہی دنوں اس اعتراض کا جواب، اپنوں میں سے کسی کیڈٹ سے نہیں، بلکہ ایک غیر کیڈٹ سے نہایت بصیرت افروز الفاظ میں سامنے آیا۔ آپ نے (VERDICT OF INDIA) کے مصنف بیورلے نکلس کا نام تو سنا ہوگا۔ اس نے انہی دنوں (۱۹۶۷ء میں) اپنے ایک بیان میں کہا تھا۔

میں نے بیس سال پہلے پاکستان کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ اور ایک دنیا میری مخالف ہو گئی۔ لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا، اس کی صداقت پر مجھے اس لئے یقین تھا کہ میں مسٹر جناح کو جانتا تھا۔ اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نسل جناحؒ سے واقف نہیں۔

یہ ہے ہماری نئی نسل کی علت مرض۔ ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی — علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

والسلام!

چوہدری حبیب احمد صاحب

لائل پوری

تصورِ پاکستان

اور

عالمانِ زنار پوش سے اظہارِ عقیدت

میرے لئے یہ امر باعثِ فخر بھی ہے اور موجبِ خطر بھی کہ میں طلوع اسلام کے لئے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں جو میرے لئے نیا تو نہیں کہ اس کے متعلق میری ضخیم کتاب تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء منظرِ عام پر آ چکی ہے لیکن مفاہمت پرست دوستوں کی دنیا میں جہاں مسلمان توحید میں تو گرم جوش ہے مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش کی حقیقت نا آشناؤں کی ناراضی کا موجب ضرور بنے گا۔ موجبِ خطر اس لئے بھی کہتا ہوں کہ جب محترم علاؤ الدین صدیقی صاحب جیسوں نے (مولانا) ابوالکلام آزاد مرحوم کو "جو آبِ کوثر سے پھسل کر لبِ گنگا پہنچے اور وہاں سے لوٹنے کی خبر آج تک نہیں آئی" رحمۃ اللہ علیہ کہہ دیا، تو عام ذہنوں تک حقیقت کا پہنچانا کس قدر مشکل ہو گا۔ میرے لئے یہ عقل کا پیدا کردہ الجھاؤ ہے لیکن جنونِ باشعور ادائیگیٔ فرض کے لئے مجبور کر رہا ہے اور بار بار کہہ رہا ہے کہ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہ ہے اس جرأتِ بیباک کا جذبۂ محرکہ۔

۸ ستمبر کو بی۔ این۔ آر میں پاکستان کلچرل کونسل کے زیرِ اہتمام قائداعظمؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ ہوا تھا جس کی صدارت وزیرِ داخلہ جناب قاضی فضل اللہ نے کی۔ اس میں جناب سید قاسم رضوی اور سید نذیر عالم صاحب کے علاوہ مولانا علاؤ الدین صدیقی اور جناب پرویز نے "تصورِ پاکستان" کے موضوع پر تقاریر ارشاد فرمائیں۔ ان دو موخر الذکر اصحاب کے احساسات و خیالات کو اخبارات و رسائل نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا اور اپنے اپنے مطلب کی حاشیہ آرائی کی ہے۔

لہ اس مضمون میں جہاں صرف ملا درج ہو گا وہ [illegible] مخالفِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کا ہو گا۔

میں بھی حاضر تھا وہاں۔ اس لئے بھی اور تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کے مؤلف کی حیثیت سے بھی مجھ پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ معرکۂ دین و وطن کی حقیقی روح کو سامنے لاؤں۔

میں نے اس خیال سے کہ پرویز صاحب کی تقریر طلوع اسلام میں شائع ہو جائے گی، ان کے پیش کردہ اقتباسات درج کرنے مناسب نہیں سمجھے۔ صرف دو ایک مزید اقتباسات درج کر کے گفتگو کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

مسلم یونیورسٹی قائداعظمؒ نے ۵ر فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی میں ایک پیغام ملّی میں فرمایا،

لیگ نے مسلمانوں کو ان کے رجعت پسند عناصر سے رہائی دلوائی ہے اور ایسی رائے تخلیق کر دی ہے کہ وہ لوگ جو خود غرضی سے اپنی ذاتی اغراض کے پیچھے پڑے ہوتے تھے قومی غدار ہیں۔ لیگ نے آپ کو مولویوں اور ملّاؤں کے ناکارہ عناصر سے بھی رہا کرا دیا ہے۔ میں مولوی کی جانب من حیث الجماعت اشارہ نہیں کر رہا ان میں بعض مخلص ہیں مگر ان کا ایک طبقہ بڑا ہے۔ میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ برطانوی حکومت، کانگرس، رجعت پسند مسلمان اور مولوی و ملّا ان چاروں سے رہائی پانے کے بعد اب آپ فرقۂ اناث کو قید و بند سے چھڑائیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم اہل مغرب کی نقالی کریں اور بیہودگیاں اور خرابیاں اختیار کریں۔ ہرگز نہیں میرا مقصد یہ ہے کہ ہماری مستورات ہماری زندگی میں نہ صرف معاشرتی بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی حصہ لیں۔

(صفحہ ۱۶۷)

شاہی دربار بلوچستان میں ۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو ایک تقریر ارشاد فرمائی جس میں کہا کہ:۔

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے۔"

(صفحہ ۱۷۳، ۱۷۴)

جناب پرویز نے "تصور پاکستان" کے ضمن میں قائداعظمؒ کے فرمودات سے کے جتنے اقتباسات پیش کئے، ان سے ثابت کیا تھا کہ قائداعظمؒ پاکستان میں ایسا معاشرہ متشکل کرنے کے آرزومند تھے جیسا معاشرہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے یہ بات بڑے واضح الفاظ میں کہی تھی۔

محترم پرویز صاحب کے بعد اسلامی مشاورتی کونسل کے صدر جناب علاؤ الدین صدیقی نے تقریر کی۔

آغاز تقریر میں آپ نے بار بار علامہ جوش و پرویز کے خیالات سے کلی اتفاق کا اظہار اور ان کے خیالات و کلمات کی پُرزور تائید کی۔ لیکن بعد میں اقتباس پیش کرکے وہ دفعتہ اس طرح گویا ہوئے کہ میں نے مسجد شاہ چراغ میں آٹھ خطبے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے لٹریچر سے مرتب کرکے دیئے تھے جن سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ (مولانا آزاد) بھی پاکستان کے حامی تھے۔ میں پہلی صف میں بیٹھا تھا۔ صدیقی صاحب سے اٹھائیں تیس سال مراسم ہیں۔ میں نے بصد حیرت مستفسرانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو فوراً پلٹ کر کہنے لگے۔ مولانا مدنی کے متعلق اقبالؒ کی جو رباعی ہے اسے تو آپ سب جانتے ہی ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر علامہ صدیقی نے ایک شعر تک نہ پڑھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شرما سے گئے ہوں۔ پھر انہوں نے چند علماء کے نام لئے جنہوں نے تحریک قیام پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ اور رُخ بدل کر فرمانے لگے کہ چند علماء کی کوتاہی سے سب علماء کو مطعون تو نہیں کیا جا سکتا۔

پرویز صاحب نے اپنی تقریر میں حضرت قائداعظمؒ کی تقریر کا وہ اقتباس بھی پیش کیا تھا جہاں انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی (مذہبی پیشوائیت) کی حکومت نہیں ہوگی، اسلام کی حکومت ہوگی۔

صدیقی صاحب نے اپنی تقریر میں زیادہ تر زور اسی پر دیا کہ علماء ہی حامل دین متین ہیں۔ آپ نے سامعین کو یہ تاثر دینے کے لئے کہ پرویز حضورؐ کی وساطت کے بغیر ہی قرآن کا نظام حیات پاکستان میں نافذ کرنا چاہتا ہے، اپنے خاص لہجہ میں اسی رباعی کا ایک شعر جسے مدنی مرحوم کے ضمن میں پڑھنے سے وہ رک گئے تھے، پڑھا ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ ظاہر ہے کہ اقبالؒ و جناحؒ کی طرح پرویز مذہبی پیشوائیت کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد نیشنلسٹ علماء کے اعتراضات کے جوابات دینے کے محاذ پر طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا۔ اور ان کے علم کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ ابوالکلام و مدنی (مرحومین) کو مذہبی رہنما تسلیم کرنے والے ان سے ذہنی انتقام لینے کے لئے وقتاً فوقتاً ان کو غلط رنگ میں پیش کرکے شکست خوردہ ماضی کو تسلی و تسکین دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں اس طرف تو بعد میں آؤں گا پہلے پرویز صاحب کی تحریروں کے چند اقتباسات پیش کروں گا کہ انہیں حضورؐ اقدس و اعظم ختمی مرتبت (فداہ ابی و امی) سے کس قدر عشق ہے۔ میرے نزدیک

ان کا اندازہ کوئی عاشقِ رسول ہی عشق کے پیمانوں سے کرسکتا ہے۔ یہ اتہامات باندھنے اور الزامات لگانے والے ان کی اس کیفیتِ قلبی کا کیا اندازہ کرسکیں گے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

امریکہ کا دریدہ دہن اخبار

امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضور ختمی مرتبت سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کی ذاتِ اقدس کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ جس کے خلاف سر عبدالحلیم غزنوی صاحب نے اسمبلی میں تحریکِ التوا پیش کی تھی۔ ۷ر نومبر ۱۹۴۱ء کے طلوعِ اسلام کے صفحہ ۵۱، ۵۲ پر پرویز صاحب لکھتے ہیں:-

"دنیا کو شاید معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن موجود ہے حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کیا ہے! وہ ذاتِ گرامی (فداہ ابی وامی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات و سعادت اور جن کی محبت سرمایۂ زندگی و متاعِ حیات ہے؛ ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ اُتم اور دنیا و آخرت کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخرِ موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا ہم تو ان کوچوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کرسکتے جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفعت و عظمت کی نقش بوسی کی سعادت نصیب ہوگئی۔ خوش بخت ہیں وہ راہیں جن میں وہ شمعِ فروزاں ضیا بار و جلوہ ریز ہوئی۔ اور زہے نصیب خاک کے ان ذروں کے جوان درخشندہ و تابناک نقوشِ قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبوبیت کے ساتھ ہمارے قلوب کا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا، ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شہنشاہِ کونین کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو پھر بھی دل کی تمنا بر نہ آئے جس سینے میں عشقِ رسول کا سوز نہیں وہ سینہ نہیں، بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمدؐ پر مرمٹنے کی تمنا نہیں وہ دل نہیں، بوم و کرگس کا وحشت انگیز کاشانہ ہے!

لیکن غلام کا عشق کیسا اور محکوم کی تمنا کیسی؟

تحفظِ ناموسِ رسول گداگری کے اجتماعات سے نہیں ہو سکتا، جماعت کی قوت سے ہو سکتا ہے۔ وہ قوت جس کے ضعف کا باعث خود جناب عبدالحلیم غزنوی بنے۔ ہم اپنے بھائی سے ناموسِ رسالت کے نام پر اپیل کریں گے کہ وہ اپنی انفرادی روش کو چھوڑ کر پھر سے جماعت میں آملیں اور یوں ریت کے بکھرے ہوئے ذروں کو ایک ایسی محکم چٹان بنا دیں، کہ

مخالفت وناسازگاری کی جو موج اس سے ٹکرائے پاش پاش ہوجائے اس وقت ہم دیکھیں گے کہ کس کی ہمت پڑتی ہے کہ وہ شہنشاہِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام تو کجا، انکے کسی ادنیٰ غلام کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ جائے۔ ؎

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

(صفحہ ۹ تا ۱۳)

پرویز کے ازلی مخالفین بآسانی کہہ سکیں گے کہ صاحب اُس دور میں وہ ایسے ہونگے۔ اب تو اُن کے خیالات میں یکسر تبدیلی آچکی ہے۔ قارئین کرام! پرویز ابوالکلام نہیں کہ اسلام سے مایوسی وبیزاری کا اعلان کر دیں اور ہم بھی اُن ایسے نہیں جو اب بھی "امام الہند" کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے سے نہیں شرماتے۔

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور نے ان کی ایک تقریر جو ۱۹۵۶ء میں "مقامِ محمدی" کے عنوان سے کی تھی، نومبر ۱۹۹۰ء میں پمفلٹ کی صورت میں شائع کی ہے۔

سرورق پر "مقامِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم اور اس کے نیچے ـــــ

گردِ اُو گردد حریمِ کائنات

لکھا ہے۔ اور تقریر کا آغاز ـــــ

"ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنید و بایزید ایں جا"

سے کرتے ہیں۔ اس میں وہ کہتے ہیں۔ برادرانِ عزیز!

"آپ کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا مشن پیامِ خداوندی کو عام کرنا ہے۔ لیکن پیامِ خداوندی سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ مقامِ محمدی نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔"

اسی پمفلٹ کے صفحہ ۲۷ پر رقمطراز ہیں:۔

"آجکل ہم (مسلمانوں) میں جو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے اور بس۔ یعنی جب وہ پیغامِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اُس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اُن کے خیال کے مطابق یوں سمجھئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ڈاکیہ کی ہوتی ہے جس کا کام محض چٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے اور بس۔"

اسی پمفلٹ کے صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں:۔

نبی کا کام خدا سے وحی پا کر اسے انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا اہم ہوتا ہے۔ نبوت نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لہٰذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا لیکن اس وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے قیام کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد اُمت کے سپرد ہوئے۔

حضورؐ کے بعد بد قسمتی سے، یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور نظامِ خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب اُمت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبویؐ میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ پالے۔

آگے چل کر کہتے ہیں :-

یاد رکھیئے برادران! انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے۔ اس کی نجات و سعادت کی صرف ایک ہی راہ ہے۔ یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدی (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے۔ اور جس کی طرف پیامِ محمدی (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے۔ ؎

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ ہے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی مشہور و معروف اس رباعی کا شعر جس کو صدیقی صاحب مدنی مرحوم کے ذکر میں پڑھنے سے عمداً گریز کر گئے تھے۔ اور ان کی زبان پر نہ آئی لیکن اپنی تقریر میں یہ رنگ پیدا کرنے کے لئے کہ پرویز حضورؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کو ضروری قرار نہیں دیتا، پڑھا تھا۔ میں نے پرویز کے لٹریچر میں یہ رباعی اُس وقت کئی ایک مقامات پر حوالہ کے طور پر دیکھی جب میں اپنی کتاب کے لئے ان کے لٹریچر سے اقتباسات لے رہا تھا۔ مولہ بالا اقتباسات سے بات نکھر کر سامنے آگئی ہے۔ مزید تسلی کرنے والے پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب "معراجِ انسانیت" کا مطالعہ کریں۔ اس سے اس جھوٹے پروپیگنڈے کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

اس شور و غوغا اور مخالفت و شورش میں یہ باریک نکتہ پنہاں ہے کہ پرویز بھی اقبالؒ و جناحؒ کی طرح دین کی اجارہ داری مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ قرآن کی روشنی میں نظامِ خداوندی کے قیام و نفاذ کی ذمہ داری امت محمدیہ کو سونپتے ہیں۔ چونکہ مذہبی اجارہ داروں کی مفاد پرستیاں خطرہ میں پڑ جاتی ہیں اس وجہ سے اجارہ دارانِ مذہب جب موقع ملتا ہے لوگوں کے جذبات پرویز کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

پرویز کا جرم عظیم

پرویز صاحب نے جیساکہ ۸؍ستمبر بی۔ این۔ آر کے جلسہ میں کہا تھا، ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام کا اجراء علامہ اقبالؒ کے منشاء کے مطابق نیشنلسٹ علماء کے نظریۂ پاکستان پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے کیا گیا تھا۔ یہی ہے پرویز کا وہ جرم کبیرہ جس کی وجہ سے یہ حضرات اُن کے خلاف شورشیں اٹھاتے اور ہنگامے بپا کرتے ہیں۔ مدنی مرحوم نے جب "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کا اسلام سوز نعرہ لگایا تھا، اس وقت کی پرویز صاحب کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

> "جن خوش بخت حضرات کو علامہ کے قرب کی سعادت نصیب تھی، ان کا بیان ہے کہ انہوں نے (حضرت علامہ نے) جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے۔ کہ یا الہ العالمین! اس ہندوستان میں تیرے اس پیغام ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے جہاں کے مفتیانِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا، تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے لیکن مسئلہ کی اہمیت ایسی تھی کہ انہوں نے جان تک کی پرواہ نہیں کی اور اس کے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرمادیا اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرمادی جس کے اندر ان کی تمام زندگی صرف ہوئی تھی۔ وہ جواب اس قدر مسکت اور محکم تھا، کہ مولانا صاحب کو کہنا پڑا کہ "میرا مقصد دہلی کے بیان میں اخبار تھا انشاء نہ تھا"۔"

مولانا مدنی نے حکیم الامت کی وفات کے بعد ان کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کیا تھا۔ انہیں جو زبان استعمال کی گئی وہ کچھ پسندیدہ نہ تھی۔ اس میں افہام حقیقت سے زیادہ حضرت علامہؒ کی شان میں نازیبا الفاظ تھے۔ اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے اُبلتے نظر آرہے تھے جو اس بات کے غماز تھے کہ اس تحریر کا محرک جذبہ کونسا تھا۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام نے لکھا۔

> "حضرت علامہؒ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے اس پمفلٹ کے جواب کے بہانہ سے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب ان کی جگہ لینے والا کون ہے؟ لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے، وہ خم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اور خمکدۂ اقبالؒ میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشم مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی ہیں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔"

اس کے بعد لکھا ہے۔

"طلوع اسلام جسے پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے۔"

سوراجی اسلام

اسی زمانہ میں پرویز صاحب نے ایک پمفلٹ "سوراجی اسلام" لکھا۔ اسکا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

اسلام کے متعلق جو نظریہ عام قومیت پرست مسلم حضرات پیش کر رہے ہیں وہ اُن سے (یعنی ہندوؤں سے) بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن ہے۔ ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کا اسلام وہ پیش کرتے ہیں وہ خود ان کے اپنے ہی دماغوں کی ساخت ہے۔ کتاب و سنت کے اسلام سے اس کا کچھ علاقہ نہیں۔ اُن کے نزدیک بھی مذہب چند رسومات و عبادات کا ہی نام ہے۔

(صفحہ ۵۲۵)

مولانا پمفلٹ میں ابوالکلام مرحوم کے دورِ الہلال اور متحدہ قومیت کے دور کی تحریروں کا موازنہ کر کے بتایا گیا ہے کہ "انسان بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ جب اس کے رجحاناتِ قلبی و ذہنی اس کی نگاہ کا ایک زاویہ بدل دیں تو وہ کس قدر تضاد کا مجموعہ بن جاتا ہے اور کس طرح زہر کو آبِ حیات بنا کر پیش کرتا ہے۔" (صفحہ ۵)

اسی سلسلہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ہم ان کے اور ان کے ہم مسلک علمائے کرام کی خدمت میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ

سرحد دین عجب شکستہ کردی　　ایماں بفدائے چشم مستے کردی
باعجز و نیاز جملہ نقدِ خود را　　رفتی و نثارِ بُت پرستے کردی

یہ تو ہم نے مشتے از خروارے کے طور پر مندرجہ بالا اقتباسات دیئے ہیں، ورنہ ۳۸ء سے لیکر آج تک طلوع اسلام کانگریسی ملایان کرام اور نقاب پوش مصلحین کو بے نقاب کرتا چلا آ رہا ہے۔

اب آپ ابوالکلام آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" سے متعلق جسے بقول راجہ حسن اختر مرحوم

مولانا محمد یوسف بنوری

حکیم الامت "قرآن کی گنگا جمنی تفسیر کہا کرتے تھے اور جس کے رد میں مجلہ "معارف" میں ہندوستان میں سب سے پہلے جناب پرویز کا مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں پرویز صاحب نے "دورالہلال" اور متحدہ قومیت کے دور کو پیش کر کے ظاہر کیا تھا کہ خیالات میں تضاد تو ایک طرف مولانا نے خود آیاتِ قرآنی کا جو ترجمہ اب کیا ہے وہ "دورالہلال" کے ترجمہ سے مختلف ہے۔

"ترجمان القرآن" پر پرویز صاحب کی اس تنقید نے ملک کے اربابِ فکر و نظر کی توجہ کو اس طرف منعطف کر دیا اور بڑے بڑے جید علما نے ان کی تفسیر (ترجمان القرآن) پر سخت اعتراضات کئے۔ (مثلاً) مولانا محمد یوسف بنوری اس باب میں لکھتے ہیں۔

> "سورۃ فاتحہ کی تفسیر بہت طویل ہے اس لئے میں نے اس کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا اور بعض دیگر آیات کی تفسیر جستہ جستہ مقامات سے دیکھی۔ دیکھ کر میرا شوق بجھ گیا اور سخت افسوس ہوا۔ اگر یہ تفسیر شائع نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ میں نے تفسیر دیکھ کر محسوس کیا کہ اس شخص کے دماغ پر خودداری اور خود پسندی سوار ہے جس کا پہلا مرحلہ تقلید سے انکار تھا، اور دوسرا یہ جس نے سیدھی راہ ان پر گم کر دی۔ انہوں نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے جملہ مذاہب خواہ وہ نصرانی اور یہودی دین ہو یا صابی۔ اگر کوئی شخص مذہب کی اسی صورت پر عامل رہے جسے کہ اس مذہب کا شارع آیا تھا تو یہ امر اسکی نجات کے لئے کافی ہے۔"
>
> (مشکلات القرآن کا دیباچہ)

دیکھ لیا آپ نے کہ مولانا محمد یوسف بنوری کی نظر میں بھی ابوالکلام صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا تھا۔

مولانا مدنی کے معتقدین

علامہ اقبال نے (مولانا) مدنی پر جو تنقید کی تھی اس سے مولانا صاحب کے معتقدین کے دل میں کس قدر تیز آتشِ انتقام بھڑک اٹھی تھی۔ اس کا اندازہ ان حضرات کی تقریروں اور تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں رہنے والے مدنی مرحوم کے مرید نجم الدین اصلاحی صاحب نے "مدنی مرحوم کے مکتوبات کو "مکتوباتِ شیخ الاسلام" کے عنوان سے تین جلدوں میں جمع کیا ہے۔ اس میں اصلاحی صاحب رقمطراز ہیں۔

"ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم

سمجھتے ہیں:۔
ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکرِ اقبال کی روشنی میں ہو تو ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔
اس لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو امام ابوحنیفہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم۔ اکابر اولیاء کے دوش بدوش بلکہ مع شیٔ زاید مرتبہ دے دیا جائے تو پھر بھی کم ہے۔ مگر ہم ہندی طالب علموں کے نزدیک تو ڈاکٹر صاحب کا وہی مقام ہے جو علامہ اقبال صاحب سہیل مرحوم کا ہے۔ یا اور بات ہے کہ آخر الذکر دکالت کی نذر ہو کر رہ گئے اور اول الذکر پنجاب کی نبوت خیز زمین کی بدولت آج شارح اور مقنن اسلام وغیرہ کے ناموں سے یاد کئے جا رہے ہیں۔ (صفحات ۲۷۱، ۲۷۲)

متاثرین دیوبند میرے نزدیک یہی ہے وہ باطنی بیماری جو متاثرین دیوبند کو پاکستان میں گھن کی طرح کھاتے جا رہی ہے۔ یہی ہے وہ جذبۂ انتقام جو انہیں پرویز کی دشمنی پر مختلف عنوانوں اور مختلف بہروپوں میں اکساتا ہے۔ کیونکہ پرویز قرآن کی روشنی میں اقبالؒ کے تصورات و احساسات کا عکاس ہے۔ بدیں وجہ یہ مذہب پرست مولویان کرام اور ان کے متاثرین و مریدین پاکستان میں پوری آسائشیں اور راحتیں حاصل کرنے کے باوجود قیام پاکستان کے معمارین' اقبالؒ و جناحؒ کے تصورات کے حامل پرویز کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

علامہ صدیقی صاحب جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' راقم الحروف کے اٹھائیس تیس سال قبل استاذ محترم میرزا عبدالحمید صاحب کی وجہ سے صدیقی صاحب سے جو دوستانہ مراسم ہیں' ان کی وجہ تحریک قیام پاکستان ہی تھی۔ میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں' کہ صدیقی صاحب کی تقریر اور "شہاب" نے مجھ پر "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" کے مؤلف کی حیثیت سے' ذمہ داری ڈال دی ہے کہ میں ایک حقیقت نگار کی طرح احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کروں۔ اس میں اب مقام پر صدیقی صاحب سے براہ راست گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) جس پرویز کی تقریر کے جملے کو آپ نے نکتۂ اختلاف بنایا تھا کہ "پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی' اسلام کی حکومت ہوگی" یہ فرمان حضرت قائداعظمؒ کا ہے' پرویز کا ذاتی نہیں۔ ان کے اس فرمان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مُلّائی تخیلِ اسلام سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ

اس مذہبی تصور سے پوری طرح آگاہ و خبردار تھے۔ آپ نے جو اختلاف کیا تھا وہ دراصل پرویز سے نہیں بلکہ حضرت قائداعظمؒ سے اختلاف کیا تھا۔ کیا آپ اس قسم کی ذمہ داری قبول کرلیں گے!

بُتانِ عجم

(۲)۔۔۔ قائداعظمؒ نے جس اقبالؒ سے متاثر ہوکر نظریۂ پاکستان کی تائید کی تھی وہ نظم میں اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ پرویز صاحب انہی کا نثر میں اعادہ کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

اور پھر ان دو اشعار پر خصوصیت سے غور فرمایئے۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بُتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی! — یہ اُمت روایات میں کھو گئی!

اب اگر پرویز تمدن، تصوف، شریعت اور کلام کو بُتانِ عجم کہہ کر اس حقیقتِ صادقہ کا اظہار کرے کہ جن روایات میں کھو کر اُمت خرافات میں کھو چکی ہے یہ عجمی سازش ہے تو اس میں اس کا آخر قصور کیا ہے؟

اگر پرویز ان روایات کو جو قرآن عزیز کے یکسر منافی و مخالف ہوں اور جن سے حضورِ اقدس و اعظمؐ کی توہین کا افسوسناک پہلو نکلتا ہو، اور جن کی تصدیق میزانِ محمدی (قرآن عزیز) نہ کرتی ہو' وضعی کہہ کر مسترد کر دینے کے قابل قرار دیدے، تو جن کی نظر نورِ فراست سے خالی ہے وہ کیوں سیخ پا ہو جاتے ہیں! اور یہ بتانِ عجم کے پجاری پرویز کے متعلق طویل الزامات کی فہرست کیوں مرتب کر ڈالتے ہیں؟

اچھے علماء

بانی جس طرح حضرت قائداعظمؒ نے اچھے علماء (جنہوں نے مسلمانوں کی منفرد شخصیت اور الگ تشخص کے لئے تحریکِ قیامِ پاکستان کی حمایت کی تھی اور عظمتِ مسلم کے جھنڈے گاڑنے کے لئے نظریۂ پاکستان کی تائید کی تھی) تعریف کی تھی' تو اس میدان میں پرویز بھی اُن سے پیچھے نہیں ہے ______ اُن کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

> ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ایک سچے عالم کی جتنی قدر ہمارے دل میں ہے شاید ہی کسی اور قلب میں ہوگی۔ ہم ایسے عالم کی خاکِ رہگذر کو اپنی چشمِ بصیرت کا سُرمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل خون ہوکر رہ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی غلط روی اور اپنی بات کی ترویج میں عالم کے صحیح مرتبہ

کو خاک میں ملا دیا۔ اور آج مولوی کا لفظ انتہائی جہالت اور تنگ نظری کا مظہر قرار پا گیا۔(ص ۹۵)

اور ایک مقام پر پرویز صاحب دورِ الہلال کے مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ اقتباسات درج کرکے جن تحریروں نے اسلامیانِ ہند کے دل اسلام کے لئے گرماتے تھے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کی تھی "متحدہ قومیت کے "امام الہند" سے یوں بصد حسرت و یاس گویا ہوتے ہیں۔

مولانا صاحب! آپ کا ہر ارشاد لعل و گہر میں تولنے کے قابل اور سر آنکھوں پر رکھنے کے لائق ہے: "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" یہ آپ کے دل کی آواز ہے۔ مگر وہ دل جس سے یہ صدائے ایمان پرور نکلا کرتی تھی، کس "بت کافر" کی نذر ہو گیا؟ ساری ملت آپ کے طورِ خطابت و تکلم اور سینۂ فراست و بصیرت پر پیہم ارنی، ارنی کی صدائیں لگا رہی ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ چپ ہیں۔ اور آپ کی طرف سے سابرمتی آشرم کی اینٹ اینٹ جواباً لن ترانی کے نعرے بلند کر رہی ہے۔ اب آپ خدائے واحد، رسولِ واحد، اور قرآنِ واحد سے مایوس ہو کر مشرکوں کے بے تاج بادشاہ گاندھی کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دے چکے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اسی طرف کھینچنے کے لئے مضطرب ہیں۔

خیابانِ خودی را وادۂ آب!
اناں دریا کہ طوفانے نہ دارد (صفحہ ۲۱۲، ۲۱۳)

(۳) قائد اعظمؒ نے جن مولویوں کے طبقہ کو برا کہا ہے کیا وہ طبقہ وہی نہیں جس نے آزاد و مدنی (مرحومین) کی زیرِ ہدایات قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی اور جو اب بھی پاکستان میں سازش و شورش کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ اور ایسی تحریکات اٹھاتے رہتے ہیں جن سے اقبالؒ و جناحؒ کے متاثرین کو لوگوں میں بدنام کیا جا سکے۔ انہی کے متعلق میں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۳ پر لکھا ہے۔

"مدنی مرحوم نے بھی جہاں تک ہو سکا پوری قوت و ہمت سے اپنی تمام توانائیاں مسلمانوں کے ملی تشخص کو برباد کرنے کے لئے صرف کر دیں اور قرآن عزیز کی واضح اور کھلی کھلی آیاتِ مقدسہ کو الٹے سیدھے معنی پہنا کر متحدہ قومیت کو حقیقی روحِ قرآنی دینے کے لئے اپنے علم و قلم کا زور صرف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیرِ اثر علمائے دیوبند نے تقریباً ستانوے فیصدی قیامِ پاکستان کی مخالفت کی۔"

نوائے وقت
۲۸ مئی ۱۹۵۸ء

کسی نے "امام الہند" کی وفات پر پاکستان میں ان کی تعریف میں کچھ لکھا۔ حمید نظامی مرحوم و مغفور کی غیرت جوش میں آئی۔ قلم جنبش میں آگیا۔ ایک طویل مقالہ لکھا جس کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے:۔

"اب اگر ہند و سامراج کے آلہ کار ابو الکلام قابلِ تعریف ہو سکتے ہیں، تو پھر میر جعفر اور میر صادق کو کیوں ملعون قرار دیا جاتا ہے، اور ان کے طرزِ عمل کو بھی سیاسی اختلاف کیوں نہیں کہا جاتا؟

ابو الکلام اور اُن کے پیش رووں میں جو فرق ہے وہ صرف زمانہ کا ہے۔ دو سو سال کے زمانی بُعد نے بنگال اور دکن کے غداروں کو تو اس طرح بے نقاب کر دیا کہ وہ ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن نظر آنے لگے۔ لیکن ——————————————

زمانی قرب، ذاتی تعلقات اور پاس و لحاظ کی بدولت مسلمانوں کی جنگِ آزادی کے غدار طرح طرح کے رنگین نقابوں میں چھپے ہوتے ہیں، مگر وہ دن دور نہیں جب حقیقت شناس مورخ ان نقابوں کو پارہ پارہ کر دیں گے اور جعفرِ آں زماں کے ساتھ جعفرانِ این زماں کی روحیں بھی قلزمِ خونیں میں مبتلائے عذاب نظر آنے لگیں گے۔ سجاد انصاری نے جس ابو الکلام کی تعریف کی ہے وہ قرآنی دعوت دینے والے مولانا ابو الکلام تھے نہ کہ اس سے منحرف ہو جانے والے شری ابو الکلام۔ اس کے علاوہ یہ تعریف جس کو محض لفاظی کہنا چاہیئے اس قدر مبالغہ آمیز ہے کہ ابو الکلام اپنی زندگی کے روشن ترین دور میں بھی اس کے مستحق نہ تھے۔

اگر ابو الکلام کو پرکھنے کا یہی معیار ہے، تو پھر انہی سجاد انصاری کا یہ قول کیوں نہ ملحوظ رکھا جائے کہ فرشتہ اور عالم دونوں گمراہ ہو کر شیطان بن جاتے ہیں۔ اس طرح "معلم الملکوت" اور "حضرت امام الہند" کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائیگی کہ ہر عالم کی موت، موتِ عالم نہیں ہوتی۔ اور ایک مخصوص دور (دورِ آغاز) کی نیکیاں بقیہ زندگی کے گناہوں کا جواز نہیں بن سکتیں۔ (صفحہ ۹۶۷، ۹۶۸)

لہ میرے خیال میں یہ تو ہو چکا ہے اور میں نے "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" میں نظامی مرحوم و مغفور کی اس آرزو کو پورا کر دیا ہے۔

دوسوداگر

جناب احمد سعید یوسفی لدھیانوی نے "دوسوداگر" کے عنوان سے ایک پوسٹر لکھا تھا جو ابوسکندر لطیف نے سیالکوٹ شہر ممتاز برقی پریس سے شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

"ساتھ ہی کانگرس داناؤں کی دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا کہ آزاد اُن کی تمنائے رام راجیہ کی تکمیل کا باعث ہو سکتا ہے، بانس پر چڑھانا شروع کیا۔ اولین دور میں مسلمان انہیں ایک مفسرِ قرآن کی حیثیت سے جانتے تھے۔ آزاد نے اپنی اسی شہرت کی بنا پر متحدہ قومیت کے لئے اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی۔ ترجمان القرآن عالمِ وجود میں آیا کہ اصل دین خدا پرستی اور نیکوکاری ہے۔ انسان جس مذہب میں چاہے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اس نظریہ نے کفر و شرک، اسلام و ایمان کے امتیازات کو ختم کر دیا۔ گاندھی جی نے اظہارِ مسرت کیا۔ ترجمان القرآن کی کئی جلدیں ہندی میں تیار کرائی گئیں۔ آزاد گاندھی کے منظورِ نظر بن گئے۔ (ص ۹۹)

انجام بخیر

میرے نزدیک جس طرح مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا ابتدائی دور جب وہ آریوں اور عیسائیوں سے مناظرے اور مجادلے کرتے تھے نہایت درخشندہ و تابناک تھا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا دورِ الہلال ہے۔ لیکن جس طرح مرزا قادیانی بعد میں اپنی سیدھی راہوں سے منحرف ہو کر غلط راستہ پر جا پڑے اور حضورِ اقدس و اعظم کی ختم المرسلینی کے بعد نبوت کا اعلان کر دیا، عین اسی طرح ابوالکلام نے بھی متحدہ قومیت کے دور میں اسلام سے مایوسی و بیزاری کا مکمل اعلان کیا۔ متحدہ قومیت کے دور کی بہت سی تحریروں کے علاوہ "انڈیا ونس فریڈم" کا صفحہ ۲۲۷ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ جب میری اور مولانا غلام رسول مہر کی ابوالکلام کے متعلق بحث چلی تھی، میں ہفت روزہ "اقدام" اور وہ "چٹان" میں لکھتے تھے تو میں نے اُس وقت بھی کہا تھا۔ اپنی کتاب میں بھی لکھا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ اسلام کے متعلق ابوالکلام کے اعلانِ مایوسی و بیزاری کے بعد ان کی بازآفرینی کی ایک سطر بھی اگر کوئی صاحب پیش کر دیں تو میں اپنے اس خیال کو ترک کر دوں گا کہ وہ اس دنیا سے اسلام سے مایوس و بیزار سدھارے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر صدیقی صاحب! آپ بھی ابوالکلام کو قائداعظمؒ کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسہ میں بھی رحمۃ اللہ علیہ کہنے کی طرح ثواب دینا چاہتے ہیں تو پھر بخل و تعصب سے کام نہ لیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی رحمۃ اللہ علیہ کہیں۔ کیونکہ قرآن کی میزان میں دونوں کا کردار ایک ہے۔ میرے نزدیک گاندھی

کا وارو ہاتی فلسفہ بھی دینِ اسلام کے خلاف ایک مکمل فلسفہ تھا۔ اس سے "قادیانی مردہ باد" اور وار دہاتی زندہ باد" تو قرینِ انصاف معلوم نہیں ہوتا۔ علم اس پر ہنستا ہے اور عقل ماتم کرتی ہے۔ اگر رحمۃ اللہ علیہ ہیں تو دونوں ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو دونوں نہیں۔

یہ آیۂ نو محترم صدیقی صاحب! جب کانگریس کے لیڈروں نے جیل سے رہائی کے بعد غالباً ۱۹۲۲ء میں ایک اجلاس کیا تھا جس کے بعد راشٹرپتی ابوالکلام نے کھل کر گاندھوی فلسفہ کا پرچار شروع کر دیا تھا، تو حضرت حکیم الامت کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ آپ نے اپنے طنز کے نہایت تیز نشتر سے ظریفانہ انداز میں کہا کہ ؎

یہ آیۂ نو جیل میں نازل ہوئی مجھ پر
گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے مسیتا

"امام الہند" نے جب وار دہاتی فلسفۂ حیات کو اپنے قلم اور زبان کے ذریعہ پھیلانا شروع کر دیا اور

شیخِ ملت با حدیثِ دلنشین
بر مرادِ او کند تجدیدِ دین

کے مصداق نظر آنے لگے تو علامہؒ نے طنزاً کہا تھا کہ یہ آیۂ نو جیل میں ان پر نازل ہوئی ہے کہ قرآن اور گیتا ایک ہی ہیں۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ سوراجی اسلام جہاتما گاندھی کے اشارہ وایما پر تراشا گیا تھا تاکہ متحدہ قومیت کے جال کو مضبوط کیا جا سکے۔ "بدری" تو ہندومت سے پہلے ہی مایوس تھا۔ اس نے گاندھی کے فلسفہ کو قبول کر لیا۔ لیکن ضدی مسیتا یعنی طائرانِ حرم (مسلمان) اس ہزرنگ زیں جال میں گاندھی کی حسبِ خواہش نہ پھنس سکے۔ کیونکہ مسلمان گنہگار و خطاکار ہونے کے باوجود دامانِ محمدی ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔

کیا علامہؒ کی زبان میں اس آیۂ نو کا جیل میں نازل ہونا اس حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا کہ وہ وار دہاتی فلسفہ کو فلسفۂ اسلام کے مدِّمقابل ایک ہندوانہ یا گاندھوی فلسفہ قرار دیتے تھے۔

ابوالکلام نے تو مایوس "بدری" کی حوصلہ افزائی کے لئے اسلام کو نیچے لا کر ہندومت کی پست ترین سطح پر کھڑا کر دیا۔ لیکن یہ "ضدی مسیتا" خواجۂ یثرب کی عزت پر کٹ مرنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

صدیقی صاحب! مجھے نہ آپ کی خداواسطے کی مخالفت مقصود ہے نہ پرویز کی وکالت مطلوب۔ میں صرف خدالگتی بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے پرویز صاحب کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں۔ اور اگر کیا ہے تو اسی طرح سے کیا ہے جس طرح آپ نے اس دن ان کی تقریر سنی تھی (کہ آپ ہمہ وقت اسی خیال میں گم تھے کہ آپ نے اللہ کرام کی مخالفت کس طرح کرنی ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ اپنی تقریر میں ان کی طرف وہ باتیں منسوب کئے جا رہے تھے جن کا ایک لفظ بھی انہوں نے نہیں کہا تھا۔ اور سامعین آپ کی اس دیدہ دلیری پر انگشت بدنداں تھے) میں نے پرویز کی کم و بیش تمام تحریروں کا مطالعہ کیا ہے ـــــ ۱۹۳۸ء سے لے کر آج تک کی تحریروں کا ـــــ اور مطالعہ بھی خالی الذہن ہو کر کیا ہے۔ ان تحریروں کی روشنی میں، میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں اور اس کے لئے سندات پیش کر سکتا ہوں کہ پرویز وہ ہے۔

(۱) جس نے علامہ اقبالؒ کے اس ایمان پرور فرمان کو حرزِ جان بنا رکھا ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(۲) پرویز دنیا کے تمام اہل مذاہب سے برملا کہتا ہے کہ وہ دین جسے خدا کے آخری رسول، محمد رسول اللہؐ نے پیش کیا تھا، بالآخر تمام نظامہائے عالم پر غالب آکر رہے گا۔ اور جب تک کاروانِ انسانیت اُن راہوں کو اختیار نہیں کرے گا جن پر حضورؐ ختمی مرتبت کے نقوش قدم تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا۔

صدیقی صاحب! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جس شخص کا ایمان، عقیدہ، مسلک یہ ہو اور اسے وہ تیس پینتیس برس سے مسلسل و متواتر برملا پیش کرتا چلا آرہا ہو، اس کے متعلق یہ تاثرات دینا کہ وہ اسلام کا مخالف اور شانِ رسالت کا منکر ہے، کسی طرح بھی مبنی بر دیانت و صداقت قرار دیا جا سکتا ہے؟ ذرا سوچئے کہ آپ تو بڑی ذمہ دار پوزیشن کے حامل ہیں!

پرویز عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے گھبرا کر واویلا نہیں کرتا۔ وہ نہایت عجز و خلوص سے قرآن کی روشنی میں جو خدائے خبیر و بصیر اور علیم و حکیم اور کریم و قدیم کا عطا کردہ ضابطۂ حیات ہے، ان کا حل تلاش کر کے اپنے فہم و تدبر کے مطابق دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ پرویز، جس کی مخالفت کے لئے آپ حضرات ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ایک شکندہ

صدیقی صاحب نے ان پانچ چار علماء کا نام لیا جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی تھی اور اس کے بعد فرمایا کہ کیا ان حقائق کی روشنی میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ علماء نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟ میں صدیقی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا سارے ہندوستان میں علماء کرام یہی پانچ چار حضرات تھے؟ سنیئے! وہاں کیفیت کیا تھی۔ ہندوستان میں علماء کی سب سے بڑی نمائندہ (اور اس زمانہ میں واحد نمائندہ) جماعت، جمعیۃ العلماء ہند تھی۔ (پاکستان کے حامی علماء کی جمعیۃ الاسلام بہت بعد میں وجود میں آئی تھی) یہ جماعت پہلے دن سے آخری دم تک، مطالبۂ پاکستان کی مخالف تھی حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، وغیرہ اس جمعیت کے صدر اور سیکرٹری تھے اور ابوالکلام آزاد ان کے سرخیل۔ اس کے بعد احرار کی جماعت تھی جس میں باقی علماء دیوبند شامل تھے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی جس قدر مخالفت کی تھی اس کا کسے علم نہیں۔ اس کے بعد جماعتِ اسلامی میں شامل علماء پاکستان کے مخالف تھے، سرحد میں سرخپوشوں کے حامی علماء پاکستان کے خلاف تھے۔ بہار میں، انصار اس کے مخالف تھے۔ کیا ان سب کا کفارہ، ان پانچ چار علماء نے ادا کر دیا تھا جن کا نام لے کر صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے علماء کرام مطالبۂ پاکستان کے حامی تھے؟ انسان کو حقائق سے اس قدر بھی آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں۔

ہفت روزہ شہاب

شہاب (جس کے مدیر کوثر نیازی صاحب ہیں) صدیقی صاحب کی حمایت میں ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے اپنی ۲۰ ستمبر کی اشاعت میں لکھا ہے کہ

> نیشنلسٹ علماء کے ساتھ سیاسی اختلاف ہمیں بھی ہے۔ لیکن ان قابلِ صد احترام بزرگوں کی عظمت اس اختلاف کی وجہ سے کم نہیں ہوتی۔ وہ بعض اصولی شبہات پر ہم سے اختلاف کرتے تھے اور بعض تشدد پسند علماء کی موجودگی میں ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ان کے شبہات یکسر بے بنیاد نہیں تھے۔

یعنی نیشنلسٹ علماء کے ساتھ شہاب کا اختلاف محض سیاسی نوعیت کا ہے۔ دین سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ ہم مدیرِ شہاب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ سے کہا تھا کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برشدہ منبر کہ ملت از وطن است! چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

تو کیا یہ محض سیاسی اختلاف تھا۔ اور علامہ مرحوم "دین" کا نام محض برائے وزنِ بیت لے رہے تھے؟

پھر اس سلسلہ میں علامہ مرحوم کا وہ بیان پڑھیئے جس میں انہوں نے ان حضرات سے اختلاف کی پوری پوری تشریح فرمائی ہے۔ ذرا اس بیان کو پڑھ کر بتائیے کہ آیا وہ اختلاف سیاسی تھا یا اس کی کوئی دینی اہمیت بھی تھی! پھر سب سے اہم بات یہ کہ ــــ کیا خود پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد سیاسی تھی یا یہ دین کا مطالبہ تھا؟ میں مدیر شہاب سے گزارش کروں گا کہ وہ اس نکتہ پر ذرا کھل کر بات کریں۔

شہاب'... ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور لکھتا ہے۔

> علماءِ پاکستان کے جس تصور کی مخالفت کرتے تھے، وہ وہی تصور تھا جسے محترم پرویز صاحب اور ان کے کچھ ساتھی پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے نظریہ پاکستان پیش کرتے ہوئے (اور قائداعظمؒ نے اس کی تائید کرتے ہوئے) یہ فرمایا کہ ہم مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطہ زمین کا مطالبہ اس لئے کر رہے ہیں کہ وہاں اسلام کا احیاء کیا جائے۔ نیشنلسٹ علماء نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ شہاب کے اس بیان سے واضح ہے کہ اقبالؒ اور جناحؒ، اس اسلام کا احیاء چاہتے تھے جسے اب پرویز پاکستان میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اگر بات یہی ہے تو پھر آپ پرویز کی مخالفت کیوں کرتے ہیں، اقبالؒ اور جناحؒ کی مخالفت کیجئے اور کھلے بندوں سامنے آیئے۔ پرویز کا نام لے کر اقبالؒ اور جناحؒ کو کوسنا تو دیانت نہیں کہلا سکتا! اور اگر اقبالؒ اور جناحؒ کا اسلام، اس اسلام سے مختلف تھا جسے پرویز پیش کر رہا ہے تو پھر نیشنلسٹ علماء اقبالؒ اور جناحؒ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟

شہاب نے یہ بھی لکھا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم کو پاکستان میں ابوالکلام آزاد صاحب ہی نے بھیجا تھا۔

اگر یہ صحیح ہے تو آنے والے مؤرخ کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ خود سید سلیمان ندویؒ کے متعلق بھی ذرا زیادہ چھان بین سے کام لے کہ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ

یکے دزد باشد دگر پردہ دار

کوہستان اس (مسلم لیگی) روزنامہ کے روئداد نویس، احسان بی۔ اے صاحب نے یہ

تحقیق انیق پیش فرمائی ہے کہ ـــ طلوع اسلام کا نام، تقسیم ہند کے بعد سننے میں آیا تھا پہلے نہیں
ـــ اس کے جواب میں، میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ ـــ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

احسان صاحب اگر فرمائیں تو انہیں طلوع اسلام کے ۱۹۳۸ء کے دور کے فائل دکھا دیئے جائیں؟ اس سے کم از کم انہیں اتنا علم تو ہو جائے گا کہ اس مجلہ نے اس زمانے میں تحریک پاکستان کی حمایت، اور نیشنلسٹ علماء کی مخالفت میں کیا کچھ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں، میں علیٰ وجہ البصیرت اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے نظریۂ پاکستان کی تاریخ مرتب کرنی ہو، تو اس کے لئے طلوع اسلام کے فائل دیکھے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔

چٹان

ہفت روزہ چٹان نے اپنی ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:۔

پرویز کا اسلام سوختنی ہے نہ فروختنی

کس قدر سچی بات نکل گئی ہے اس مجلہ کی زبان سے! پرویز کا اسلام واقعی قابل سوختنی نہیں کیونکہ وہ مشتمل ہے قرآن حکیم کے ان حقائق پر جنہیں باطل کی کوئی آگ جلا نہیں سکتی۔ باقی رہا "قابل فروختنی اسلام" سو وہ کہاں ملتا ہے، اس کے متعلق خود محترم مدیر چٹان کی زبان سے سنیئے جنہوں نے چٹان جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۱۶، مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء میں بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دود چراغ محفل" (قسط نمبر ۱۰) میں اس روئیداد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔ (اسے میں نے اپنی کتاب میں بھی درج کیا ہے) غور سے سنیئے:۔

"جہاں تک کانگریس کے روپے کا تعلق ہے وہ خود مولانا حبیب الرحمٰن کے علم میں ہے بلکہ پچاس ہزار روپے کی قسط دلوانے کے حصہ دار ہی آپ تھے۔ رہا یونینسٹ پارٹی کے روپے کا سوال تو میرا مخبر تمام کا غذات شاہ جی یا مولانا غلام غوث کو دکھانے کیلئے تیار ہے۔ ان کے سوا وہ کسی کو بھی کاغذ دکھانے کے حق میں نہیں۔ وہ سب کو ناقابل اعتبار سمجھتا ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"جب مولانا دھتکار کر جانے لگے تو شاہ جی نے روک لیا: مولوی صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں آپ کے خلاف یا جماعت کے خلاف شورش کچھ چارج لگا رہا ہے۔ مولوی صاحب

رُک گئے ہیں۔ لے ترتیب وار چارج لگانے شروع کئے۔ کانگریس کا روپیہ ساٹھ ہزار۔ دس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط۔ اور یونینسٹ پارٹی۔ !! ابھی فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ مولانا غلام غوث نے ایک ایک شق پر زور دیا۔ کچھ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ پھر سکوت ٹوٹا۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ یہ روپیہ لیا گیا ہے۔ لیکن اُس وقت اُن کے ذہن میں صحیح یاد نہیں کہ یہ رقم کتنی ہے بات صبح پر ملتوی ہو گئی۔

پھر تحریر ہے :-

مولانا مظہر علی نے تسلیم کیا کہ یہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اس کے سزاوار وہ تنہا نہیں بلکہ باقاعدہ مشورہ سے رقم قبول کی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد غزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اُس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی انہیں حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی۔

یعنی --- شیخ حسام الدین نے مولانا حبیب الرحمٰن کو لدھیانہ خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں کانگرس ہائی کمانڈ تک پہنچیں۔ یہ خط لیکر خاقان بابر (مولانا مظہر علی کے صاحبزادے) لدھیانہ پہنچے مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر سردار پٹیل جو کانگرس کے خازن تھے اس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ بھیم سین سچر کی تحویل میں دیا گیا جو انکی معرفت دفتر احرار میں پہنچا پھر اس رقم کی بندر بانٹ کی گئی۔ وہ رقم جو یونینسٹ پارٹی سے وصول کی گئی اور جس کو بہ اختلاف مولانا نے تسلیم کیا اور وہ رقم جو دو چار ہزار بطور چندہ فراہم کی گئی یہ تمام ملکر پچانوے یا پچاس ہزار بنتے ہیں۔ جب مولانا مظہر علی نے بتایا کہ نواب زادہ نصراللہ خان کے سوا ورکنگ کمیٹی کے ہر امیدوار ممبر نے اُن سے روپیہ لیا ہے تو سب نے تسلیم کیا۔ شیخ حسام الدین مان گئے، ماسٹر تاج الدین نے سر ہلا دیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے بھی صاد کیا۔"

حرفِ آخر

آخر میں، میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے نہ کسی سے خدا واسطے کا بیر ہے، نہ کسی کی وکالت مقصود۔ میں ان حضرات سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ کسی کی مخالفت کریں تو حقائق کو نہ چھپائیں۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت ایک نہ ایک دن سامنے آجاتی ہے اور جب وہ سامنے آتی ہے تو آپ کے مخالف کا کردار اور بلند ہو جاتا ہے اور آپ حضرات لوگوں کی نگاہوں سے گر جاتے ہیں۔ خدا کرے کہ اس ناصح مشفق کی بات آپ کی سمجھ میں آجائے۔ والسلام!

رابطۂ باہمی

بزمِ لاہور

ارکان بزم آئندہ کنونشن کی تیاری میں پورے انہماک سے مصروف ہیں۔ ۱۰/اکتوبر ۱۹۷۶ء کی شام کو ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں محترم پرویز صاحب نے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور اور لاہور چھاؤنی اور تحریک کے معاونین کو خطاب کیا۔ تاکہ طلوعِ اسلام کنونشن کی غرض وغایت اور تحریک کے بنیادی مقاصد کے حصول میں ان اجتماعات کی اہمیت نکھر کر سامنے آجائے۔ نیز انہوں نے تحریک کے پیدا کردہ خاموش اور موثر ذہنی انقلاب کی بھی نہایت دلکش پیرائے میں وضاحت فرمائی۔ اور بتلایا کہ "طلوعِ اسلام" کی نئی اشاعتی اسکیم اور قرآن کے ٹیپ شدہ درس کے سلسلے نے بہت نمایاں اثر پیدا کیا ہے۔ مفکرِ قرآن کا مسلسل درس اب سورۃ الانفطار تک پہنچ چکا ہے۔ درس اب اتوار کی صبح ۹ بجے شروع ہوتا ہے۔

بزمِ کراچی

سندھ اسمبلی ہال میں ہفتہ وار ٹیپ شدہ درس کے علاوہ بزم نے کراچی یوم دفاعِ پاکستان منایا اور مفکرِ قرآن کی معرکۃ الآرا تقریر "شفق رنگ یادوں کے چراغ" کا ٹیپ شہر کے متعدد مقامات پر سنایا جسے بہت پسند کیا گیا۔ بزم کے ارکان آئندہ کنونشن میں شمولیت کی تیاری گرمجوشی سے کر رہے ہیں۔ بزم نے کنونشن میں پیش کرنے کے لئے کئی ایک تجاویز ادارہ کو بھیجی ہیں۔

بزمِ پنج کسی

نئی اشاعتی اسکیم کے ماتحت یہ بزم رسالہ طلوعِ اسلام اور تحریک کے پیام کی نشر و اشاعت میں مقامی حالات کے مطابق عمل پیرا ہے۔ تمام ممبرانِ بزم کے لئے رسالے پورے سال کے لئے ادارہ سے جاری کرائے جاتے ہیں جن میں ایسے ارکان بھی شامل ہیں جو ماہانہ عطیہ یا چندہ دینے سے معذور ہیں۔

بزمِ سیّد حسین

بزم کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہوتے ہیں جن میں درسِ قرآن

بذریعہ ٹیپ کا سلسلہ جاری ہے۔ ارکانِ بزم تحریک کو عام کرنے کی ہر طور پر کوشش کر رہے ہیں۔

بزمِ جلالپور جٹاں

بزم جلہ جیم طلوعِ اسلام اور متعلقہ پمفلٹس کو زیادہ سے زیادہ احباب تک پہنچانے کی کوشش جاری ہے جس کا خوشگوار اثر روز بروز سامنے آ رہا ہے۔ بزم میں کئی نئے اراکین کا اضافہ ہوا ہے۔

بزم لاہور چھاؤنی بزم کے ماہانہ اجلاس باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ مجلہ طلوعِ اسلام اور متعلقہ لٹریچر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچانے کی کوشش جاری ہے۔ ارکانِ تحریک کو عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں جن کے نہایت حوصلہ افزا نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

بزم جلال پور جٹاں بزم کے اجلاس ہفتہ وار ہو رہے ہیں۔ ماہِ ستمبر میں غازیوں اور شہیدوں کی یاد میں ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔ یہ بزم جلد ہی درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ بھی شروع کرے گی۔

بزم گھوئینکی یہ بزم طلوعِ اسلام اور قرآنی فکر کے دیرینہ شیدائی محترم محمد حسین (پنشنر) کی مساعی جمیلہ سے حال ہی میں قائم ہوئی ہے۔ اس کوشش میں ان کے ساتھ مقامی احباب میں سے چوہدری نذیر احمد، چوہدری محمد علی صاحبان بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف اور ان کے رفقاء کے خلوص اور بلند ارادوں میں استقامت عطا فرمائے۔ (ادارہ کی جانب سے بزم گھوئینکی کے قیام کی توثیق ہو چکی ہے)۔

دیگر بزمیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں تحریک کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔ انعقادِ کنونشن کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کرتے ہوئے بزموں کی طرف سے کنونشن میں شرکت کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کنونشن سابقہ کنونشنز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کامیاب رہیگی۔ واللہ المستعان!

خورشیدِ عالم

اسرائیل کا عالمی کردار

پچھلی متعدد قسطوں میں بالعموم اور اکتوبر کی قسط میں بالخصوص یہ صراحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی مزاجی کیفیت کیا تھی۔ جنگ کی آگ بھڑکی تو اس کی مِس خام کندن بنتی دکھائی دی لیکن یہ آگ فرو ہوئی تو اس کی بجھتی تپش سے امریکہ کا سونا مٹی بننے لگا۔ امریکہ جنگ میں تازہ دم شریک ہوا تھا اور جنگ اس کے ہاں سے دور دور رہی۔ متحارب ملکوں میں ایک امریکہ ہی تھا جو جنگ کی ہلاکت باریوں سے محفوظ رہا۔ محفوظ ہونے کا یہ احساس اس کا دماغ خراب کرنے کے لئے کچھ کم نہ تھا کہ وہ دنیا کا واحد ایٹمی ملک بھی بن گیا۔ ایٹمی قوت کے زور پر وہ جاپان جیسی عسکری طاقت کا زور توڑ چکا تھا۔ یہ غیر معمولی حربہ پہلی بار (امریکی) انسان کے قبضے میں آیا تھا اور دنیا اس کی تباہ کاری دیکھ کر دہشت زدہ ہو چکی تھی۔ امریکہ زبانِ حال سے پکار رہا تھا ــــ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ! اور اس کا کسی سے کچھ جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ دنیا دم بخود تھی۔ لیکن مجرد طاقت ایک فیصلہ کن ...... عنصر حیوانی سطح پر تو ہے انسانی زندگی میں نہیں انسانی زندگی میں مشیت اپنے انداز سے مصروفِ کار رہتی ہے۔ اور ضرورت کے مطابق حیران کن طور پر ان قوانینِ طبعی کی کارفرمائی واژگوں کرتی رہتی ہے جو حیوانی زندگانی میں روکے نہیں رکتے اور معینہ نتائج پیدا کئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ دنیا ایک جنگل ہوتی اور مختلف انسان جانوروں کی قومیں ہوتے تو امریکی درندہ اس جنگل کا بادشاہ بن چکا ہوتا۔ لیکن مشیت ہر آن انسان کی جستجو میں رہتی ہے وہ انسانی زندگی کو انسانی سطح پر رکھنے کے لئے انسانی معاون تلاش کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ اور وہ کامیاب عین اس وقت ہوتی ہے جب نظر بظاہر اس کی ناکامی یقینی دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کو یقین ہو چلا تھا کہ اس نے مشیت کو ایٹم بم کے زور سے شکست دے دی ہے اور ساری دنیا اس کی حلقہ بگوش بننے ہی والی ہے۔ لیکن جیسا کہ پچھلی قسط میں لکھا جا

چکا ہے، امریکہ پر یہ حقیقت کھل جانے میں زیادہ وقت نہ لگا کہ ایٹم بم اپنی تمام تر خوفناکی کے باوجود اس کے لئے کارِ بے بنیاد ہے۔ وہ ایٹم بم سے شست باندھے دیکھتا ہی رہ گیا اور ایشیا میں استعمارِ فرنگ کے حلقہ ہائے دام ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔ وہ خود چین ہی سے بے آبرو ہو کے نہ نکلا بلکہ کوریا تک میں اسے منہ کی کھانی پڑی۔ امریکہ کی حرکاتِ مذبوحی دیکھنے کے قابل تھیں۔ وہ جن ایٹمی دانتوں سے جاپان کو کھا گیا تھا وہ جاپان سے اِدھر کھلنے کے نہیں صرف دکھلانے کے رہ گئے تھے۔ ایشیا میں خلاف استعمار طوفان اٹھا تو امریکہ کا ایٹم بم اس کے لئے خس و خاشاک کی طرح بے بس دکھائی دیا۔ اس سیلِ بے پناہ کو روکنے کے لئے امریکہ نے ہندچینی میں پنجے گاڑ لئے اور آہستہ آہستہ جنوبی ویٹ نام کو استعماری مستقر میں تبدیل کر لیا۔ ویٹ نام کا محاذ جس کے مضمرات پر گذشتہ صحبت میں بات ہو چکی ہے، تیار کیا جا رہا تھا تو ایشیا کے دوسرے کونے یعنی عالمِ عرب میں بھی ایک محاذ بڑی عیاری سے تیار کیا جا رہا تھا۔ دونوں استعمارِ فرنگ کے سنبھالے تھے۔ مشرقِ بعید میں جو کردار امریکہ ادا کر رہا تھا، وہی کردار برطانیہ فلسطین میں ادا کر رہا تھا۔

اپنے سیاسی تسلط کے دوران میں برطانیہ نے فلسطین کو استعماری دسیسہ کاریوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ یہ محض استعمار ہی کی کرشمہ سازی نہیں تھی بلکہ اس بے پایاں نفرت کا نتیجہ بھی تھا جو سینۂ عیسائیت میں اسلام کے خلاف کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور جسے صلیبی جنگوں کے سلسلے میں مجنونانہ طور پر ہوا دی جاتی رہی تھی۔ یورپ کے نزدیک برطانیہ کا فلسطین پر قبضہ صدیوں سے لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کے معرکوں میں سے ایک اہم معرکہ تھا۔ اور اس کی خواہش بھی تھی اور کوشش بھی کہ یہ معرکہ فیصلہ کن ہو اور صلیب کو ہلال پر قطعی فتح حاصل ہو جائے۔ پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں نے فلسطین پر قبضہ کیا، تو فیلڈ مارشل ارل ایلن بی باوردی ہونے کے باوجود ننگے سر اور ننگے پاؤں بیت المقدس میں داخل ہوا اور اس نے کہا — اے خدا! اے مسیح مقدس! تیرے کرم سے آج صلیبی جنگ ختم ہوئی۔ چنانچہ قابض ہونے کے بعد سے برطانیہ نے بڑی دیدہ دلیری اور پُرکاری سے سفید فام یہودانِ یورپ کا رُخ فلسطین کی طرف موڑ دیا کہنے کو ان کی آمد کے لئے ایک تناسب مقرر کیا گیا لیکن عملاً ان کے لئے فلسطین کے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے اور پہلے سے طے شدہ علاقوں میں انہیں مسلط کیا جانے لگا۔ فلسطین میں یہودیوں کی آبادی بہت بڑی بین الاقوامی سازش تھی۔ اور یورپ اور امریکہ کے افسانوی حد تک متمول یہودی اور یہود نواز طبقے اس کے پشت پناہ تھے۔ برطانیہ کی شہ اور یورپ اور امریکہ کی معاونت کے نتیجے میں فلسطین میں یہودیوں کی تعداد چند ہی صدی سے بڑھ کر عربوں کے ہم پلہ ہونے لگی۔ برطانیہ نے مزید چالاکی یہ کی کہ یہودیوں کے لئے مخصوص علاقوں میں سے اصل باشندوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ بے دخل ہونے والوں

میں مسلمان عرب ہی نہیں تھے عیسائی عرب بھی تھے۔ اور تو اور عرب یہودیوں کو بھی ان علاقوں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان یورپی یہودیوں کو ہر طرح کے اسلحہ سے مسلح کرایا گیا۔ اور انہیں دہشت انگیزی کی کھلی چھٹی مل گئی۔

فلسطین کا تاریخی پس منظر پیشتر ازیں (طلوع اسلام، فروری ۱۹۹۶ء میں) پیش کیا جا چکا ہے۔ اور ایک حد تک تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ برطانیہ نے فلسطین پر یہودیوں کو مسلط کرنے کے لئے کیا کیا چالیں چلیں اور کس دجل و فریب سے کام لیا۔ یہ بہت بڑی بین الاقوامی سازش کے تحت ہوا اور انگریز نے دھوکہ دینے اور جھوٹ بولنے کے بڑے گھناؤنے مظاہرے قدم قدم پر کئے۔ اس تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں البتہ اس استعماری کارنامے کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جو برطانیہ عالم اسلام میں سرانجام دینے میں لگا ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں یورپ کے لئے ترکی خطرہ ختم ہو گیا تھا۔ ترکوں کو شکست ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس خلافتِ عثمانیہ کی بساط قطعی طور پر تہ ہو گئی تھی جس سے یورپ لرزہ براندام رہتا تھا اور اسے ہر دم یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ اسلام کا سیلاب اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ترک ترکیہ میں گھر گئے اور خلافت سے دست بردار ہو گئے تو یورپ نے ایک حد تک اپنی مراد پائی۔ اپنے عزائم استعمار کی مزید تکمیل کی اس نے یہ صورت پیدا کر دی کہ سلطنتِ عثمانی کے حصے بخرے کر کے ان میں ایسی بادشاہتیں قائم کر دیں جو ترقی کیا بقا تک کے لئے برطانیہ کی محتاج تھیں۔ یہ بادشاہتیں عربوں کی تھیں۔ عرب پہلے ترکی خلافت میں شامل تھے لیکن برطانیہ نے انگریز کارندوں اور عرب گماشتوں کی وساطت سے ان میں ترکوں کے خلاف جذبات پیدا کئے اور نسلی اور جغرافیائی آزادی کے سبز باغ کا وہ منظر دکھایا جس سے وہ پہلی بار آشنا ہوئے۔ برطانیہ نے مکر و زور سے ان کی آنکھیں خیرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح عالم عرب کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آیا وہ استعماری سازش کا شاہکار تھا۔ عرب ترکوں کے خلاف لڑے ہی نہیں تھے ان کے دلوں میں ترکوں کے خلاف زہریلا مواد بھی بھر دیا گیا تھا۔ اس طرح ترک و عرب مفاہمت ناممکن بنا دی گئی۔ لیکن خود عربوں میں منافرت کے ایسے بیج بو دیئے گئے جن کے ثمرات تلخ آج تک منہ کا مزہ بگاڑے ہوئے ہیں۔ ایک تو یوں شاہانِ عرب برطانیہ کے رحم و کرم پر تھے، دوسرے ان کے درمیان ذاتی اور خاندانی خصومتیں اور رقابتیں تھیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر عرب ترکوں کے خلاف رہے اور فرداً فرداً آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ برطانیہ ان کے تار ہلاتا رہا، اور تماشہ بھی دیکھتا رہا۔ اور فائدہ بھی اٹھاتا رہا۔

عالم عرب کا یوں حلیہ بگاڑنے کے ساتھ ساتھ استعمارِ فرنگ نے فلسطین کو اس مقصد کے لئے

چنانکہ اگر عربی علاقوں سے یورپ کا سیاسی تسلط ختم بھی ہو جاتے تو اس کے استعماری عزائم کی تکمیل کی یقینی صورت موجود ہو اور رہے۔ ایسی صورت اسرائیلی حکومت کے قیام سے پیدا کی گئی۔ جو یہودی فلسطین میں لائے گئے تھے وہ یورپ نژاد تھے۔ پھر انہیں مسلح کر کے دہشت انگیزی کی راہ پر ڈال دیا گیا تھا۔ اور اس دہشت انگیزی کا رُخ عربوں کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ گویا یہ اہتمام کر لیا گیا تھا کہ عربوں اور یہودیوں میں مفاہمت نہ ہو سکے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہیں، البتہ یہودی اس حد تک طاقتور ضرور ہوں کہ وہ عربوں سے دب نہ سکیں بلکہ انہیں نیچا دکھا سکنے کے قابل ہوں۔ یوں اسرائیل کا ولد یورپ بطنِ فلسطین سے نمودار ہوا۔ یہی یورپ کا منشا تھا اور یہی استعماری چال بھی۔ قضیہ فلسطین کی تاریخ کا کسی طور اور کسی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے اس نتیجے سے مفر نا ممکن ہے کہ یہ استعماری عزائم کی کارفرمائی ہے۔ اول تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سفید فام یہودیوں کو فلسطین میں جائز و ناجائز ذرائع سے لا کر بسایا جائے لیکن اگر بالفرض اس کا کچھ جواز تھا تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ برطانیہ فلسطین پر اپنا انتداب ختم کرتا تو فلسطینی نمائندے اختیاراتِ حکومت سنبھالتے اور برطانیہ کی بے دخلی کے بعد فلسطین میں جو نظم سیاسی تشکیل پذیر ہوتا، اس میں یہودی اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق شریک کر لئے جاتے۔ لیکن برطانیہ نے یہ غیر معمولی اور ناقابلِ جواز اقدام کیا کہ فلسطین کو اس انداز سے چھوڑا کہ اسرائیل خود بخود قائم ہو گیا حالانکہ اہلِ فلسطین نے تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

برطانیہ درمیان سے نکل گیا تو یہودی ایک ملک اور حکومت بن گئے اور اعراب فلسطین سے براہِ راست متصادم ہو گئے۔ عالم عرب اس گہری استعماری چال کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس کی متفرق حکومتوں نے اپنے طور پر اس کا مقابلہ تو کیا لیکن نہ تو وہ اس سازش کی گہرائی سمجھ سکیں اور نہ اس کے مقابلے کے لئے کوئی مشترکہ محاذ قائم کر سکیں۔ عرب یوں بھی اس خطرے کے حریف نہ ہو سکتے اور ناکام ہوتے لیکن برطانیہ اس ڈرامے کا ایک اور منظر سامنے لے آیا اور ایک نئے اور وسیع تر محاذ پر پہنچ کر اسرائیل کے استحکام اور عربوں کی شکست کے لئے کام کرنے لگا۔ وہ امریکہ کو پہلی جنگ عظیم ہی کے وقت اس سازش میں شریک کر چکا تھا۔ دوسری جنگ کے بعد وہ امریکہ کو اس ڈرامے کا مرکزی کردار بنانے پر مجبور ہو گیا اس لئے بھی کہ جنگ نے اسے یہ بار خود اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور اس لئے بھی کہ یہودیوں کے بے پناہ اثر اور استعماری ذہن کی بنا پر امریکہ ہی اس ذمہ داری کے لئے اہل اور موزوں تھا۔ یورپ نژاد امریکہ کا خمیر استعماری تو تھا لیکن دوسری جنگ کے بعد ایٹم بم کی اجارہ دارانہ ملکیت کے باوجود اسے عالمی سطح پر جو پسپائی ہوئی اس نے امریکہ کی نفسیات کو بنایت متشدد کر دیا اور وہ یورپ کی

زہریلی ذہنیت کی علامت بن کر سراپا زہر بن گیا۔ زہر بھی بقول اقبالؒ — آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب —— اس زہر سے فلسطین کی رگِ جان کی تواضع کرنے کے لئے برطانیہ اقوامِ متحدہ پہنچا اور سادگی اور پُرکاری سے اپنی معذوری کی دُہائی دے کر اس نے اسرائیل کے ولدِ یورپ کو امریکہ کی گود میں پھینک دیا۔

اقوامِ متحدہ میں سازش کا دوسرا محاذ کھل گیا۔ وہاں تقسیمِ فلسطین کے لئے منصوبہ وضع کیا گیا اور عربوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ جنگ بند کر کے اسرائیل سے امن و صلح کی بات کریں۔ استعماری سازش کو بین الاقوامی سندِ جواز عطا کرنے کی یہ طفلانہ کوشش تھی۔ اس طرح وہ کج خشتِ اول رکھی گئی جس پر بیس سال سے کج دیوار اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ نے اپنے فیصلے کی رُو سے اسرائیل کی حدود سلطنت مقرر کیں۔ یہ تحدید اصلاً نامنصفانہ تھی کیونکہ اسرائیل کو وہ علاقہ دیا جا رہا تھا جو اقوامِ متحدہ کا نہیں بلکہ عربوں کا تھا اور جسے عرب دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بہرحال جب تقسیم کی تجویز سامنے آئی تو پتہ چلا کہ یہودی برطانوی سازش کے طفیل اقوامِ متحدہ کی بخشش سے زیادہ علاقہ ہتھیا چکے ہیں۔ یہ علاقے خالی کرنے پر انہیں مجبور نہیں کیا گیا۔ الٹا عربوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ براہِ راست گفتگو سے، زائد علاقے خالی کرائیں ایسا کرنے کی وجہ ظاہر تھی۔ امریکہ عربوں کو اس طریقے سے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ولدِ یورپ کو جائز اولاد سمجھیں اور اپنے ہاں رکھ کے اس کی رضاعت اور پرورش کو گوارا سمجھیں۔ یہ علاقے آج تک خالی نہیں ہوئے۔ اسرائیل نہ پیچھے ہٹنے پر تیار ہوا اور نہ اُسے اس پر آمادہ یا مجبور ہی کیا گیا۔ علاقائی امن اور اقوامِ متحدہ کے وقار کا تقاضا تھا کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کر دیا جاتا جو عالمی ادارے نے اپنے طور پر اور اپنے مصالح کی بنا پر متعین کی تھیں۔ لیکن یہ تحدید اسرائیل کو پیچھے ہٹانے کے لئے نہیں عربوں کو شکست اور رسوائی کو دوام بخشنے کے لئے کی گئی تھی۔ استعمارِ یورپ کا کلیجہ ٹھنڈا تھا کہ جس فصلِ صلیبی کو صلاح الدین نے کاٹ کے رکھ دیا تھا وہ پھولتی پھلتی مزرعِ فلسطین تک پہنچ چکی ہے اور صلیبی جنگوں کے مقصود و منتہا کو حاصل کرنے کے لئے اسرائیل کا ایسا تخت مہیا کیا جا چکا ہے جس پر ایک جست حصولِ مراد کو یقینی بنا دے گی اور فلسطین کا قصہ تمام کر دے گی۔

امریکہ شغلِ استعمار میں رہا اور اقوامِ متحدہ تماشہ دیکھتی رہی۔ شغل اور تماشہ اپنی جگہ، فلسطین میں جو صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی وہ ایک حال پر رہ نہیں سکتی تھی۔ استعمار کی ہر تعمیر میں یہی خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے کہ وہ ایک حال میں رہ نہیں سکتی اور جب حال دگرگوں ہوتا ہے تو ساری تعمیر متزلزل ہو جاتی ہے۔ وہ زمین گیر ہو تو، فلک بوس ہو تو، اس کے برقرار رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرار پختہ بنیاد کیلئے

ہے۔ اور بنیاد وہی پختہ ہے جو انسانی قلب کی گہرائی سے اٹھے۔ استعمار، استحصال اور دجل کو انسان نے نہ کبھی دل سے قبول کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ انسانی زندگی میں اس سے بڑا کارِ بے بنیاد اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکار کرے۔ لیکن یورپ کا انسان ہنوز ارتقاء کی اس منزل میں ہے جس میں شیر کی شیری کے مسلنے کا تو چلن ہے، تہذیب و اخلاق کی اقدار کا گذر ممکن نہیں ہو سکا۔ اور کبھی اس بادِ نسیم کا ہلکا سا جھونکا اِدھر آیا بھی ہے تو بادِ سموم کہہ کر اس نے اس سے اِبا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ نے ایک سے ایک ٹیڑھی اینٹ استعمال کرنے پر اصرار کیا ہے۔ ان ٹیڑھی اینٹوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل مل کر مصر پر چڑھ دوڑے۔ وہ اس پر وقفِ التہاب تھے کہ فلسطین کی مٹی میں یورپ نے جو تخمِ استعمار بویا تھا وہ آٹھ سال تک بارآور نہیں ہو سکا تھا۔ اور اس دوران میں سپہر بریں نے جو رنگ بدلے تھے' وہ یورپ کے لئے نظر افروز نہیں ہو سکے تھے۔ اس صدی کے نصف آخر میں یہ عریاں جارحیت استعمارِ فرنگ کے دیدۂ بے غیرت ہی کی کارستانی ہو سکتی تھی ۔۔ اور جب تک یہ آنکھ باقی ہے اس کارستانی کے مظاہرے ہوتے رہیں گے۔

جارحیت کا ۱۹۵۶ء کا مظاہرہ بدیہی طور پر بلا جواز تھا۔ عالمی سطح پر اس کی بجا طور پر مذمت ہونے لگی تو امریکہ کے لئے اپنے استعماری گماشتوں کا اعلانیہ ساتھ دینا آسان نہ رہا۔ اس کی کوشش سے جنگ بند کرادی گئی اور اقوامِ متحدہ کی فوج نگرانی کے لئے متعلقہ علاقے میں بھیج دی گئی۔ جارحیت کی مخالفت کر کے امریکہ نے وہ کام کیا جو اس کے گماشتے جارحیت کے زور پر نہیں کر سکے تھے۔ اقوامِ متحدہ کے سلتے ہیں ایلات کی بندرگاہ اسرائیل کی تحویل میں دے کر عقبہ کی خلیج اس کے لئے کھول دی گئی۔ اس سے عربوں نے اسرائیل کی جو ناکہ بندی کر رکھی تھی' اس میں رخنہ پڑ گیا۔ گویا بجائے اس کے اسرائیل کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اقوامِ متحدہ کی حد بندی قبول کر کے پیچھے ہٹتا' اسے اور علاقہ دلوا دیا گیا اور ایک سمندری راستہ اس کے لئے کھول دیا گیا۔ اس سے یہ مسئلہ اسرائیل کے لئے شدت اختیار کر گیا کہ یہ آبی گزرگاہ کھل گئی ہے تو آئندہ کے لئے کھلی رہے۔ اور اس کے علاوہ نہر سویز بھی اس کے لئے اسی طرح کھل جائے تاکہ بیرونی دنیا سے اس کے روابط رواں ہو جائیں۔ یوں ایک جارحیت سے دوسری جارحیت کا جواز نکلنے لگا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر مصر نے نہر سویز کو پوری طرح اپنی تحویل میں لے لیا۔ بین الاقوامی قبضے میں ہونے کی وجہ سے نہر کسی وقت بھی ایک نہ ایک بہانے سے اسرائیل کے لئے کھل سکتی تھی۔ بیشتر بندی کی یہی صورت تھی کہ نہر کا انتظام کلیتہً مصر کے پاس آجائے۔ مصر نے یہ انتظام اپنے ذمے لے بھی لیا، اور اسے یورپی طعن و استہزاء کے باوجود حسن و خوبی سے چلا کے دکھا بھی دیا۔ لیکن یہ صورتِ حال ایسی

تھی کہ اس کی منڈ اس کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ اس کو قرار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ امریکہ براہِ راست بھی اور اپنے حواریوں کے ذریعے سے بھی اسرائیل کی صلاحیتِ جارحیت میں اضافہ کرتا رہا۔ جارحیت ــ مسلسل اور بھرپور جارحیت ــ کے بغیر وہ مقصد پورا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا جس کے لئے استعمار یورپ نے اسرائیل کا تخم خبیث زمینِ عرب میں بویا تھا۔ یہ تیاری جاری رہی اور جون ۱۹۶۷ء میں اس کا نتیجہ دنیا بھر نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اپنا منصوبہ مکمل کرنے کے بعد اسرائیل نے اچانک عربوں پر حملہ کر دیا اور چار دنوں کے اندر اندر سب کو بے بس کر کے نہر سویز کے مشرقی کنارے تک جا پہنچا۔ اس بہت بڑی اور حیران کن فتح سے اسرائیل اپنے مقصد کے بہت قریب تو پہنچ گیا لیکن اسے پوری طرح حاصل نہ کر سکا۔ اب وہ خلیج عقبہ اور نہر سویز دونوں کے ایک ایک کنارے پر قابض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں آبی راستے اس کی مرضی کے بغیر چل نہیں سکتے لیکن وہ انہیں از خود رواں نہیں کر سکتا۔ اور یہ راستے نہ کھلیں تو اس کی معیشت خاصی تنگ رہے گی۔ یہی ہے وہ تعطل لیکن تعطل ایسا ہے جو عظیم طوفان لانے کا موجب ہو سکتا ہے اور ہو کے رہیگا۔

عرب فی الوقت شکست خوردہ بھی ہیں لیکن وہ اس شکست کو دائمی سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ہے بھی درست۔ اس قسم کے نشیب و فراز حرفِ آخر نہیں ہوتے۔ یورپی دنیا میں اس شکست کا بہت چرچا کیا گیا ہے اور مزے لے لے کے اس داستان کو دہرایا گیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ وغیرہ ممالکِ مغرب میں جنگ کے دوران یوں لگتا تھا کہ وہ اسرائیل کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ اسرائیل کی فتح پر وہ خوشی سے پاگل ہوئے جاتے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی وہ یہی چاہتے تھے کہ اسرائیل کی فتح مکمل بھی ہو اور دائمی بھی ثابت ہو۔ امریکہ نے حسبِ عادت اقوامِ متحدہ میں اسرائیل کی جنگ خوب لڑی۔ ایشیا و افریقہ کے بہت سے ممالک نے بڑی دلسوزی سے اقوامِ متحدہ پر زور دیا کہ وہ اپنے موقف کے مطابق اسرائیل کو عرب علاقے خالی کرنے پر مجبور کرے۔ روس نے ان ممالک کی ہمنوائی کی۔ سلامتی کونسل کے اونٹ کو کسی کروٹ بیٹھتے نہ دیکھ کر روس نے جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بھی طلب کرا لیا لیکن امریکہ نے ایک نہیں چلنے دی اور ارکانِ اقوامِ متحدہ پر ہر پہلو سے دباؤ ڈال کر اس نے یہ فضا پیدا کر دی کہ اجلاس بے نتیجہ ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اسرائیل کی جارحیت کی مذمت کرنا تو درکنار، اجلاس کے لئے یہ اعلان تک کرنا ممکن نہ رہا کہ اس کی خواہش یہ ہے کہ اسرائیل عرب علاقے خالی کر دے۔ امریکہ نے بڑی دیدہ دلیری اور کامیاب کوشش کی کہ اقوامِ متحدہ کوئی دو ٹوک رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ امریکہ کا مقصد ظاہر ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ عرب ممالک اسرائیل کے ولد یورپی استعمار کو قبول کر لیں اور اس کے روبرو ہو کر اپنی شکست کا اعتراف کریں اور امن کی بھیک مانگیں۔ تنگ لپیٹ کی یہ چوکی برتر رہے اور امریکہ اس کی وساطت سے

عالمِ عرب کو زیرِ استعمار رکھ سکے۔ اس دستاخیز سے عالمِ عرب میں جو تبدیلیاں آئی ہیں یا آ رہی ہیں، ان کا جائزہ علیحدہ عنوان کے تحت دوسری صحبت میں لیا جائے گا۔

اسرائیل کے متعلق بھی وہی بنیادی حقیقت سامنے رکھنے کے قابل ہے جس کی وضاحت ویٹ نام کے سلسلے میں کی جا چکی ہے (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۶۷ء) اسرائیل اور ویٹ نام امریکہ کے وہ اڈے ہیں جہاں سے وہ ایشیا میں استعمار کی پسپائی کا سلسلہ روکنے میں لگا ہوا ہے۔ ویٹ نام چین کے خلاف اڈہ ہے اور اسرائیل عالمِ اسلامی کے خلاف۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یورپ کے غلبہ و استیلاء کے خلاف پچھلی صدی کے آخر میں اور اس صدی کے شروع میں جو تحریکیں اٹھی تھیں وہ چین اور عالمِ اسلامی ہی سے اٹھی تھیں۔ امریکہ حریت کے یہ دونوں سرچشمے پاٹ دینے میں لگا ہوا ہے لیکن امریکہ کی تدبیر پر تقدیر کچھ اس طرح خندہ زن ہے کہ اسرائیل اور ویٹ نام میں وہ اس حد تک ننگا ہو گیا ہے کہ اسکے حق میں وہ چند کلمات جو اب بھی نہیں کہے جا سکتے جو ان اقوام یورپ کے حق میں کہنے کو کہے جاتے تھے جن کا ممالکِ ایشیا پر سیاسی تسلط رہا۔ امریکہ کی موجودگی کا کوئی جواز نہ ویٹ نام میں ہے نہ اسرائیل میں۔ اس کی یہ دیدہ دلیرانہ موجودگی خلافِ استعمار قوتوں کے لئے کھلی دعوتِ مبارزت ہے۔ یہ قوتیں ابھر کر متحد ہوتی جا رہی ہیں اور استعمارِ فرنگ کے خلاف ایک عالمی محاذ قائم کرنے میں کوشاں بھی ہیں اور ایک حد تک کامیاب بھی۔ اس محاذ کی تشکیل اور کامیابی میں وقت لگے گا، اسلئے بھی کہ مقابلہ سخت ہے اور اسلئے بھی کہ بھارت جیسا عظیم ایشیائی ملک امریکہ کا گماشتہ بنکر اس عالمگیر محاذ کے قیام میں رخنے پیدا کرنے کا موجب بن گیا ہے جو امریکی استعمار کے خلاف ایشیا میں تیار ہو رہا ہے۔ بھارت ویٹ نام میں بغضِ چین کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اسرائیل میں بغضِ پاکستان کا۔ حریت و آزادی کی موجِ بیباک کا ساتھ دینے کی بجائے وہ اس فکر میں ہے کہ کہیں اس میں امریکی استعمار کا گھر نہ بہ جائے۔ اس نے اپنی تمام تر امیدیں امریکہ سے وابستہ کر لی ہیں۔ ویٹ نام اور اسرائیل ایشیا کے لئے استعمار کی واپسی کے کھلے راستے ہیں تو بھارت کے لئے امریکہ تک پہنچنے کے چور دروازے۔ ویٹ نام کے سلسلے میں بھارت کے کردار کا جائزہ پہلے لیا جا چکا ہے۔ اسرائیل کے سلسلے میں اس نے عربوں کی شکست پر اس طرح شادیانے بجائے جس طرح مغرب میں بجائے گئے۔ اسرائیل استعمار کا کھلا خنجر ہے تو بھارت اسکا پنہاں دشنہ۔ لیکن ایشیا کے بعض ممالک اس کے منہ کے رام رام سے زیادہ متاثر ہیں اور اسکی بغل کی چھری سے بہت حد تک غافل ہیں۔ اس سے خلافِ استعمار محاذ کے قیام میں تاخیر ہو رہی ہے لیکن جیسے امریکہ بے نقاب ہو گیا ہے اسی طرح اسکا حلقہ بگوش بھارت بھی بے نقاب ہو کے رہیگا۔ بھارت بے نقاب ہوتا جائے گا تو محاذ مستحکم ہوتا جائے گا۔ امریکہ اور بھارت مل کر بھی اس روزِ حساب کو ٹال نہیں سکتے جو آتا دکھائی دے رہا ہے ـــــ اور آ کے رہے گا!

پاکستان کا معمّارِ اوّل

ہم نے سرسید کا تعارف "پاکستان کا معمارِ اول" کہہ کر کرایا تو بعض احباب نے ہم سے پوچھا ہے کہ سرسید پاکستان کے معمارِ اول کس طرح ہیں۔ اس سوال کے مفصل جواب کے لئے سرسید کے نظریات اور سیاسی سرگرمیوں کا تفصیلی طور پر سامنے لانا ضروری ہے۔ اس کے لئے نہ یہ موقعہ ہے اور نہ ہی گنجائش۔ (انہیں اس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے جو حال ہی میں ہماری طرف سے شائع ہوئی ہے) لیکن ہم اس مقام پر صرف ایک نکتہ کا سامنے لانا کافی سمجھتے ہیں۔

تحریکِ پاکستان کا پس منظر یہ ہے کہ ہندوؤں کی اسکیم یہ تھی کہ جب انگریز یہاں سے چلا جائے، تو ہندوستان میں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں اور یہ اکثریت اور اقلیت ناقابلِ تغیر تھی۔ دیگر جمہوری ممالک میں ہوتا یہ ہے کہ اگر انتخابات میں ایک سیاسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ آئندہ الیکشن میں (بلکہ بعض اوقات اس سے بھی پہلے) اقلیت کی پارٹی اکثریت حاصل کرلے اور اس طرح اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ لیکن ہندوستان میں اس اکثریت (میجارٹی) اور اقلیت (مینارٹی) کی بنیاد مذہب پر تھی اس لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ مسلمان کبھی اکثریت حاصل کر کے اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ لہذا، ہندوستان میں، جمہوری حکومت کے معنی یہ تھے کہ مسلمان، ابدی طور پر ہندوؤں کے محکوم رہیں۔

اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے کہا کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے۔ مسلمان اپنے دین کی بنا پر ایک الگ اور مستقل قوم ہیں اور ہندو الگ قوم۔ لہذا، دو مختلف قوموں میں مشترکہ حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان اپنی الگ حکومت چاہتے ہیں۔ یہ تھی مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اور اسی بنیاد پر پاکستان کا حصول عمل میں آیا تھا۔

اس پس منظر کے بعد، سرسیدؒ کی طرف آیئے۔ ۱۸۸۵ء میں، ہندوؤں اور انگریز کی ملی بھگت سے کانگرس کا وجود عمل میں آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد، کانگریس کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ یہاں کی حکومت میں، ہندوستانیوں کو بھی نمائندگی ملنی چاہیئے۔ اور یہ نمائندگی ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہو۔ یہ تحریک، ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت کے قیام کے لئے بنیادی اینٹ تھی اور خود انگریز بھی اس کے حق میں تھا۔ اس زمانے میں یہاں مسلمانوں کی حالت شودروں سے بھی بدتر تھی اس لئے کوئی ایسی اسکیم جس میں مسلمانوں کو (آبادی کے تناسب کے لحاظ ہی سے سہی) نظم و نسقِ حکومت میں حصہ مل جاتا، نعمتِ غیر مترقبہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ ملک میں ہر طرف سے اس تجویز کا جذبہ ومسرت کے ساتھ استقبال ہوا۔ لیکن لوگوں کی (جن میں مسلمان بھی شریک تھے) حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سرسیدؒ (جس نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے دن رات ایک کر رکھا تھا) اس کے مخالف ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں، ملک میں شور اٹھا اور اس زمانہ کے نہایت نامور اخبار، پاؤنیر (الٰہ آباد) نے سرسیدؒ سے پوچھا کہ اس کی مخالفت کی وجہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں سرسیدؒ نے اس اخبار کو ایک خط لکھا جس میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ اس خط کا وہ حصہ، جس کا تعلق اس خاص موضوع سے ہے، درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ اسے غور سے پڑھیئے اور پھر سوچیئے کہ جس دیدہ ور نے ۱۸۹۳ء میں یہ بات کہی تھی، وہ پاکستان کا معمارِ اول کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں؟ خط ملاحظہ فرمایئے۔ (یہ اخبار "پاؤنیر" کی ۲۲ر ستمبر ۱۸۹۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا)؛

(بنام ایڈیٹر، پائنیر، الٰہ آباد)

"اس سے بہت پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا ہو، میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ (REPRESENTATIVE GOVERNMENT) ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اور جان اسٹوارٹ مل کی آراء بتائید ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ کے (جو آراء غالباً نہایت عمدہ توضیح سے بیان کی گئی ہیں) پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اول لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لئے جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو، یہ ہے کہ ووٹرز میں ہم جنسیت ہو۔ بلحاظ قوم کے اور مذہب کے، اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے۔ اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے۔ یعنی ریپریزینٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ لازمی امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امورِ بالا میں ہو اور جب یہ باتیں موجود ہوں،

تو یہ طریقہ حکومت عمل میں آسکتا ہے یا مفید ہو سکتا ہے۔ جہاں یہ امور موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جاتے۔ تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں۔ سوائے ملک کے امن و بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

اور میں دل سے امید کرتا ہوں کہ خواہ کنزرویٹو (CONSERVATIVE) یا لبرل (LIBERAL) یا یونینسٹ (UNIONIST) یا سیپریٹسٹ (SEPARATIST) بلحاظ آئرلینڈ کے یا زیادہ سے زیادہ ریڈیکل کو بھی جب پارلیمنٹ میں قوت حاصل ہو، تو وہ اس امر کو نہ بھلا دیں گے کہ ہندوستان براعظم ہے یا مثل انگلستان یا سکاٹ لینڈ یا ویلز یا آئرلینڈ کے ایک چھوٹا سا ملک نہیں ہے اور اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں جن کے تمدنی اور اخلاقی اور سوشل اور پولیٹیکل اور مذہبی اور طبعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

. . . . سلطنت جمہوری کی کامیابی کے لئے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ اس آبادی میں ہم جنسیت ہو۔ اور جتنے وہ زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ جمہوری حکومت میں ضروری خیال کر لیا جاتا ہے کہ افراد ایسے ہی مشابہ ہیں جیسے دو مٹر کے دانے۔ . . . .

. . . . لیکن باایں ہمہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد مبنی ہیں تاریخی واقعات زمانہ گزشتہ وحال کے بھلا دینے پر، اور ہندوستان کی مختلف اقوام کا لحاظ نہ کرنے پر، اور یہ فرض کر لینے میں کہ مسلمان اور مرہٹہ، برہمن اور چھتری، بنیا، اور شودر، سکھ اور بنگالی، مدراسی، اور پشاوری سب سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور سب ایک ہی قوم سے ہیں، اور ان کا مذہب ان کی زبان، ان کی عادات اور مراسم، اور ملکی اور تاریخی روایات بالکل ایک ہیں۔ اور ان سے اس طرح بحیثیت مجموعی برتاؤ کیا جا سکتا ہے۔ گویا وہ انسانوں کا ایک گلہ ہیں۔ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لئے یکساں موزوں ہے۔ . . . .

. . . . . کل دنیا کے ممالک میں سے ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں، ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لئے موزوں ہے اور میں اس تجربہ

کو جو انڈین نیشنل کانگریس ... کوشش کرنا چاہتی ہے، ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کل اقوامِ ہند کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے۔ کیونکہ اگرچہ مسلمان میناریٹی (MINORITY) ہیں۔ لیکن سب سے بڑی متحد میناریٹی ہیں اور کم سے کم روایتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب میجاریٹی (MAJORITY) ظلم کرے تو تلوار ہاتھ میں لیں۔"

(مکتوباتِ سرسیدؒ۔ مرتبہ شیخ محمدؐ اسمٰعیل پانی پتی۔
(صفحہ۔ ۶۲۳ - ۶۳۲)

آپ نے غور فرمایا کہ اس مردِ راہ داں نے کس طرح 'اثنا عصر پہلے' مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کے تصور کو نمایاں کیا تھا؟ اور اس کی یہ بصیرت نتیجہ تھی اس فراست کا جو اسے قرآن کریم پر غور و تدبر سے حاصل ہوتی تھی۔ سرسیدؒ نے ۱۸۹۳ء میں یہ کچھ کہا تھا (بلکہ اس نے تو ۱۸۶۵ء میں اپنے کمشنر سے کہہ دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں) اور مولانا حسین احمدؒ مدنی (مرحوم) ۱۹۳۸ء میں فرماتے تھے کہ قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اور پھر مرتے دم تک عملاً اسی مسلک پر قائم رہے۔

☼

پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

ہر اتوار کو صبح ۹ بجے

۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور میں

ہوتا ہے

حقائق و عبر

اسلام کی تصویر

ماسکو سے حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے (A DICTIONARY OF PHILOSOPHY -) اصل کتاب روسی زبان میں تھی اسکا انگریزی ترجمہ بعد میں شائع کیا گیا۔ اس میں "اسلام" کا تعارف حسب ذیل الفاظ میں کرایا گیا ہے :-

"اسلام یا محمڈن ازم، مذاہب عالم میں سے ایک مذہب ہے۔ دیگر اہم مذاہب، عیسائیت اور بدھمت ہیں۔ اسلام، زیادہ تر مشرق وسطےٰ، شمالی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اسلام، ساتویں صدی (عیسوی) میں عرب سے اٹھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اہل عرب، قدیم قبائلی زندگی سے طبقاتی معاشرت کی طرف آ رہے تھے۔ اسلامی خلافت نے انہیں ایک جاگیردارانہ ـــ مذہبی پیشوائیت کے نظام میں منسلک کر دیا۔ اسلام اسی طریق عمل کا نظریاتی عکس ہے۔ اس لئے یہ حکمران طبقہ کے مفادات کا محافظ بن کر سامنے آیا۔ اسلام کے عقائد و نظریات، مسلمانوں کی مقدس کتاب، قرآن، میں منضبط ہیں۔ یہ (کتاب) قدیم مذاہب اور یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے ملے جلے عناصر سے مرکب ہے۔ اس کی بنیاد خدا کی ہستی پر ایمان پر ہے۔ لیکن جس محور کے گرد اس کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے وہ تقدیر کا عقیدہ ہے۔ قرآن کی رو سے، خدا نے ہر انسان کی قسمت پہلے سے متعین کر رکھی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان، خدا کے مقابلہ میں بے بس ہے اس لئے اسے اس کی مرضی کے سامنے بلا چون و چرا سر جھکا دینا اور اس کی اور اس کے رسولوں کی اطاعت کئے جانا چاہیئے۔ اس کے بدلے میں اسے آخرت میں جنت عطا ہو جائے گی۔ کفار کے ساتھ دشمنی، عورت کی فرو تری، اور تعدد ازدواج اس کی اہم خصوصیات ہیں۔ اسلام معاشرتی عدم مساوات کو حق بجانب قرار دیتا ہے، اور لوگوں کو اگلی دنیا کی مسرتوں کے لا حاصل انتظار میں رکھ کر

انقلابی جدوجہد سے دور ہٹائے رکھتا ہے۔" (ص ۲۲-۲۲۳)

یہ ہے اسلام کا وہ تصور جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر صاحبِ ہوش مسلمان کو یقیناً رنج بھی ہوگا اور تاسف بھی۔ لیکن ہمیں اس پر غصہ یا افسوس کے اظہار کے بجائے سوچنا چاہیئے کہ اسکی وجہ کیا ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ

(۱) یہ اسی اسلام کی تصویر ہے جسے ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے۔ آپ ان عقاید کو جو اوپر بیان کئے گئے ہیں کسی مولوی صاحب کے سامنے (یہ بتائے بغیر کہ اس کا ماخذ کیا ہے) پیش کیجئے۔ وہ تصدیق کر دیں گے کہ یہ صحیح اسلامی عقاید ہیں۔

(۲) اگر کوئی شخص ان غلط تصورات کی بجائے صحیح اسلام پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے (جس کا ماخذ قرآن ہو) تو اس پر کفر و الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں۔

(۳) اور اسوقت (ہماری معلومات کے مطابق) دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے ہم کسی غیر مسلم کے ہاتھ میں یہ کہہ کر دیدیں کہ اس سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجائیگا۔ جتنی کتابیں اسلام کے نام سے شائع ہوتی ہیں وہ اس مخصوص فرقہ یا جماعت کے تصورِ اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں جس کیطرف سے وہ شائع ہوتی ہیں۔

(۴) حکومتِ پاکستان سے (جو اسلام کے نام سے وجود میں آئی ہے) بجا طور پر اسکی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ دنیا کے سامنے صحیح اسلام پیش کر کے اس فریضہ سے سبکدوش ہوگی جو اس پر عاید ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ مُلّا کے پراپیگنڈے سے اسقدر خائف ہے کہ یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ ہمارا مروجہ مذہب صحیح اسلام کی نمائندگی نہیں کرتا، اسکی اصلاح کی طرف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی انداز جمہوریت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں برسرِ اقتدار طبقہ (خواہ وہ اقتدار کی مسندوں پر متمکن ہو اور خواہ انہیں حاصل کرنے کے لئے کوشاں) عوام کی اصلاح کرنے کے بجائے ان کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ باقی رہے مسلمانوں کے وہ ممالک جہاں جمہوریت نہیں، بلکہ ملوکیت کا نظام ہے، سو ملوکیت تو خود اسلام کی ضد ہے۔ وہاں سے اسلام خالص کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔

یاد رکھیئے! خالص اسلام صرف قرآنِ کریم کے سرچشمہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ اسلام ہے جسے پیش کرنے کی سعادت طلوعِ اسلام کو حاصل ہے۔ یہی وہ اسلام ہے جسے دنیا علیٰ وجہ البصیرت قبول کر سکتی ہے لیکن طلوعِ اسلام کے وسائل نشر و اشاعت کی محدودیت اسکے عالمگیر تعارف کے راستے میں حائل ہے۔

ضمناً۔ اس کتاب کے آخر میں جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ جو قارئین اسکے متعلق اپنے خیالات یا تجاویز پیش کرنا چاہیں، وہ ذیل کے پتہ پر خط تحریر فرما دیں۔

(PROGRESS PUBLISHERS 21, ZUBOVSKY BULEVARD MOSCOW, U.S.S.R.)

(۲) مشینی ذبیحہ

آجکل اخبارات میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ انگلستان میں مشینوں کے ذریعے جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں، ان کا گوشت حلال ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس بھی بہت سے استفسارات آتے ہیں۔ ہم اس تفصیل سے درگزر کرتے ہوئے کہ اس بحث میں فلاں صاحب نے کیا کہا اور فلاں نے کیا فرمایا، اتنا بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا حکم ہے۔

(۱) حلال جانوروں کا گوشت کھانے کے متعلق پہلا حکم یہ ہے کہ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ. (۶/۱۱۹) "سو تم کھاؤ اس (جانور کے گوشت) میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ اگر تم احکامِ خداوندی پر ایمان رکھتے ہو۔"

(۲) اسی کی تائید میں منفی طور پر فرمایا۔ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (۶/۱۲۱)، اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

لہٰذا ذبیحہ کے حلال ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

(۳) سورۂ مائدہ میں ہے:-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ...... (۵/۳)

حرام ہوا تم پر مردہ جانور، اور (بہتا ہوا) لہو، اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جس کا گلا گھٹ جائے یا چوٹ لگ جائے یا اوپر سے گر جائے یا سینگ لگنے سے زخمی ہو جائے یا جسے درندوں نے کھایا ہو۔ ہاں اگر تم ایسے جانور کو مرنے سے پہلے ذبح کر لو (تو وہ حرام نہیں ہوگا)

اس آیت میں مردار اور ذبیحہ کا فرق بتا دیا گیا ہے اور وہ فرق ہے مَا ذَكَّيْتُمْ۔ تَذْكِيَة کے بنیادی معنی ہوتے ہیں حرارتِ غریزی کا خارج کر دینا (امام راغب) اور مطلب ہوتا ہے جانور کا خون بہا کر اس کی حرارتِ غریزی کا ختم کر دینا۔ جب کسی جانور کا اس طرح خون بہا دیا جائے تو اس کے بعد وہ بھی مردہ ہو جائے گا لیکن یہ حلال ہوگا اور وہ جانور جو خون بہائے بغیر مر جائے، حرام ہوگا۔

لہٰذا کسی جانور کے حلال ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ اسکا خون بہا دیا جائے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مشین سے ذبح کرنے میں جانور کا خون بہتا ہے یا نہیں۔ اگر اسکا خون نکل جاتا ہے تو پھر (قرآن کریم کی عاید کردہ) دوسری شرط پوری ہو جائے گی۔

لہٰذا اگر حلال جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے اور جانور کا خون خارج ہو تو اسکا گوشت حلال ہوگا خواہ اسے قصاب کی چھری سے ذبح کیا جائے یا مشین سے۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی ساقط

ہو جائے تو اسکا گوشت حرام ہوگا۔ (سدھائے ہوئے جانوروں کے شکار کا ذکر سورۃ مائدہ کی آیت ۴ میں ہے)

(۴) سورۃ مائدہ کی آیت ۵ میں ہے:۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۔ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۔ (۵)

آج تمہارے لئے تمام طیب چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا بھی بشرطیکہ وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے حلال سمجھیں۔

اہلِ کتاب کے طعام کے حلال ہونے کے یہ معنی نہیں کہ انکے ہاں کی ہر چیز ہمارے لئے حلال ہے۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہوگا۔ یعنی ایک حرام شے مسلمانوں کے ہاں سے لیجائے تو حرام ہوگی۔ لیکن وہی شے اہلِ کتاب کے ہاں سے لے لی جائے تو حلال ہو جائیگی! (یا للعجب) اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں انکا اہلِ کتاب کے ہاں سے لیکر کھا لینا بھی حلال ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں عام متعارف اہلِ کتاب یہودی اور نصرانی تھے۔ عیسائیوں کے متعلق تو معلوم نہیں لیکن یہودی اب تک فی ذبیحہ پر خدا کا نام لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن کریم میں نصرانی بھی ذبیحہ پر خدا کا نام لیتے ہونگے۔ اسی لئے ان کے ذبیحہ کو مشرکین کے ذبیحہ سے متمیز کر دیا گیا۔ لیکن اگر اب عیسائی ذبیحہ پر خدا کا نام نہیں لیتے تو ان کا ذبیحہ بھی ہمارے لئے حلال نہیں ہوگا۔

انگلستان (اور دیگر غیر مسلم بیرونی ممالک) میں مسلمانوں کے لئے گوشت کا مسئلہ آج سے نہیں شروع ہی سے بڑا پریشان کن چلا آرہا ہے۔ پاکستان سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ولایت جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی طرف سے یہ شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں گوشت کا مسئلہ بڑی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صرف ایک انگلستان میں اب مسلمانوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ لیکن حیرت ہے کہ نہ تو وہ خود ہی اس کا کوئی تسلی بخش انتظام کرسکے ہیں اور نہ ہی ہمارے ہائی کمشنر کی طرف سے اس ہر روز کی مشکل کا کوئی حل تجویز کیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی ایسا ہی عقدہ لاینحل ہے سوال صرف اس کی اہمیت کے احساس کا ہے۔ ہم حکومت سے درخواست کرینگے کہ وہ جہاں ملک سے باہر جانے والے اہلِ پاکستان کی دیگر مشکلات کا خیال رکھتی ہے، اس سوال کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔

باقی رہا خود پاکستان میں مشین کے ذریعے ذبیحہ کا سوال، سو اگر مشین کے ذریعہ ذبیحہ سے جانور کے خون کا اخراج ہو جاتا ہے، تو ان مشینوں سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یہاں، ان مشینوں کے ذریعے ذبح کرنے والے تو بہرحال مسلمان ہی ہونگے اور وہ جانور پر اللہ کا نام بھی لیں گے۔

مطالب الفرقان

(۲)

(پارۂ عمّ کا تشریحی ترجمہ۔ مسلسل از اشاعتِ سابقہ۔ جس کا تمہیدی نوٹ دیکھ لیا جائے)

سورۃ تطفیف (۸۳)

(۱۷)۔ (۱) تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لئے جائیں لیکن جب اُنکے واجبات دینے کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی مار لی جائے۔ دوسروں سے کام پورا لیا جائے لیکن اس کا معاوضہ کبھی پورا نہ دیا جائے۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ کمایا جائے۔ چیزوں ہی کی نہیں، بلکہ خود انسانوں کی قیمت متعین کرتے وقت بھی یہی خیال رہے۔ اور کوشش یہ کی جائے کہ ان کی صلاحیتیں دبی، سمٹی، سکڑی اور بندھی رہ جائیں۔ انہیں پوری جولانی کا موقعہ ہی نہ ملنے پائے۔ انہیں اتنا ہی اُبھرنے دیا جائے جتنا، سرمایہ لگانے والے کے لئے مفید ہو۔ انہیں اس سے زیادہ آزادی دی ہی نہ جائے۔

(۲) کیا ان لوگوں کو اتنا خیال نہیں آتا کہ یہ نظام ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتا۔ وہ وقت آئے گا کہ جن لوگوں کو انہوں نے یوں اقتصادی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے وہ انہیں راستے سے ہٹا کر آزادی حاصل کر

لیں گے۔

(۴)-(۵) اور اس طرح وہ انقلاب عظیم واقع ہوگا جس میں لوگ، خدا کا عالمگیر نظام ربوبیت قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (۳۹/۴۹ ؛ ۵۴/۳۴-۳۶ ؛ ۱۲۴/۴۰-۴۸ ؛ ۸۹/۱۶)

(۷) اُس وقت، اُن لوگوں کا اعمالنامہ، جنہوں نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے خود انہیں جکڑ باندھ کر رکھ دے گا (اور یوں ان کا اپنا وضع کردہ نظام خود ان کی تباہی کا موجب بن جائیگا)

(۸) تم یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گے کہ ان کی یہ جکڑ بندیاں کس قسم کی ہونگی) نہیں خدا کے سوا اس حقیقت سے کوئی آگاہ نہیں کر سکتا۔

(۹) یہ اُس قانونِ مکافات کے مطابق ہوگی جو (ہر ایک کے مآل اور انجام کی) نشاندہی کئے جا رہا ہے۔

(۱۰-۱۱) یہ تباہی ان لوگوں کے لئے ہوگی جو اس قانونِ مکافات کی تکذیب کرتے ہیں۔

(۱۲) اور یہ ظاہر ہے کہ اس قانون کی تکذیب وہی شخص کر سکتا ہے جو ہر قسم کے جرائم نہایت جرأت اور بے باکی سے کرتا چلا جائے ـــــ ایسے جرائم بھی جن کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود ہو اور ایسے بھی جو متعدی ہوں۔ وہ جرائم بھی جو سرکشی کے جذبات ابھاریں اور وہ بھی جن کا نتیجہ افسردگی اور اضمحلال ہو۔ ایسا شخص یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ ایسا کوئی قانون نہیں جس کی رو سے مجھے میرے جرائم کی سزا مل سکے۔

(۱۳) جب اس کے سامنے وہ تاریخی حقائق پیش کئے جائیں جن میں بتایا گیا ہو کہ سابقہ اقوام میں سے جنہوں نے اس قسم کے جرائم کئے وہ تباہ و برباد ہو گئیں، تو وہ، بجائے اس کے کہ ان شواہد سے عبرت حاصل کرے، یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ یہ محض پچھلے لوگوں کے افسانے ہیں۔ (مجھ سے ان کا کیا تعلق؟)

(۱۴) (اُن سے کہو کہ) بات یہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کے غلط اعمال اس طرح زنگ بن کر ان کے دلوں میں جم گئے ہیں کہ ان میں اب سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ (۲/۷)

(۱۵) یہ لوگ (اس دور میں جب تمام نوعِ انسان خدا کی ربوبیت عامہ کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی) اس ربوبیت کے ثمرات سے محروم رہ جائیں گے۔ ان کی مزرعِ ہستی زمین شور کی طرح بے برگ وگیاہ رہ جائے گی (اس دنیا میں بھی ان کی یہی حالت رہے گی اور اُخروی زندگی میں بھی)۔

(۱۶) یعنی اُن کی نشوونما رک جائے گی (کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما تو دوسروں کی ربوبیت سے

ہوتی ہے، نہ کہ ان کے حقوق تلف اور ان کی محنت سلب کر لینے سے)۔ یوں وہ جہنم میں داخل کئے جائینگے۔

(۱۷) وہاں اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے ہمارے اُس قانونِ مکافات کی رُو سے تمہارے اعمال کا نتیجہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

(۱۸) ان کے برعکس، ان لوگوں کا مقام، جو زندگی میں وسعت اور کشاد پیدا کرتے ہیں، بلندیوں پر ہوگا۔ وہ زندگی کے ارتقا کی اگلی منزل میں ہوں گے۔

(۱۹) تجھے خدا سے زیادہ بہتر کون بتا سکے گا کہ یہ بلندیاں (ارتقائی منازل) کیا ہیں؟

(۲۰) یہ بھی ہمارے اس قانون مکافات کے مطابق ہوگا جو ہر ایک کے اعمال کی نشاندہی کئے جا رہا ہے۔

(۲۱) اور جسے یہ مقربین اپنے سامنے کھلا ہوا پائینگے ۔۔۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے اندر صفات خداوندی کو زیادہ سے زیادہ منعکس کر لیا ہوگا۔

(۲۲) یہ ابرار ۔۔۔ یعنی وسعتوں کے مالک ۔۔۔ زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے بہرہ یاب ہونگے۔

(۲۳) اختیارات و اقتدارات کے تختوں پر متمکن ۔۔۔ ہر بات کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے ۔۔۔ یعنی جہاں بانی اور جہاں بینی، دونوں خصوصیات کے مالک۔

(۲۴) ان آسائشوں کی پیدا کردہ فرحت و شادابی کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہونگے۔

(۲۵) انہیں (زندگی کی توانائیوں کے لئے) بادۂ خالص پینے کو ملے گا جو ہر قسم کی آلائش و آمیزش سے پاک ہوگا۔ یعنی سربمہر آبگینوں میں بند۔

(۲۶) ان آبگینوں کی مہریں بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہونگی

یہ ہیں زندگی اور توانائی کو بڑھانے والے اسباب و عناصر جن کے حصول کے لئے تمہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جذبہ ہر انسان کے اندر ہے لیکن غلط بین انسان اس کے لئے میدان غلط منتخب کرتا ہے۔ وہ محض طبیعی زندگی کے مفاد کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے حربے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس جذبہ کی تسکین کے لئے صحیح میدان یہ ہے کہ تم نوعِ انسان کی پرورش کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اس سے تمہیں زندگی بخش "بادۂ رحیق" ملے گا۔ (۲/۱۴۸ ؛ ۵/۴۸)

(۲۷) اس بادۂ رحیق میں اس چشمے کا آبِ خنک و شیریں ملایا جائے گا۔ جو شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔ اور انسانی صلاحیتوں کی بھرپور نشو و نما میں ممد و معاون ہوتا ہے (۷۶/۱۷)

(۲۸) یہ وہ چشمہ ہے جس سے، وہ لوگ جو اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حد بشریت) منعکس کر لیں،

زندگی اور اس کی توانائیاں حاصل کرتے ہیں۔

(۲۹) وہ لوگ جن کی روش یہ ہے کہ وہ دوسروں کی محنت کے پھل لوٹ کھسوٹ کر اپنے ہاں لے آتے ہیں، جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، اور اس کے قیام کے لئے کوشاں ہیں، تو ان پر ہنستے ہیں (کہ ان بیوقوفوں کو دیکھو جو یہ سمجھتے ہیں کہ اصل فائدہ دوسروں کو دینے میں ہے، اُن سے لینے میں نہیں)

(۳۰) یہ جب ان (مومنین) کے پاس سے گزرتے ہیں تو ایک دوسرے کو کنکھیوں سے اشارے کرتے ہیں (کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں)

(۳۱) اس کے بعد جب یہ اپنے ہم خیال لوگوں کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو عجیب انداز سے اتراتے ہیں اور جماعتِ مومنین پر پھبتیاں کستے ہیں۔

(۳۲) غرضیکہ وہ جب بھی اس جماعت کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ لوگ کس غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں، یہ بالکل بہک گئے ہیں۔

(۳۳) حالانکہ انہیں، ان (مومنین) پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا (کہ یہ اُن کے اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں)

(۳۴) (اس وقت تو یہ کیفیت ہے) لیکن جب وہ دورِ انقلاب آئے گا تو یہی ایمان والوں کی جماعت، ان لوگوں پر ہنسے گی جو ہمارے قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں۔

(۳۵) یہ، اختیارات و اقتدارات کی مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے (کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہو رہا ہے)

(۳۶) اُن کی یہ حالت خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کا عمل لوٹ کر اس کی طرف آ جاتا ہے (اُسی سے اس کی جنت اور جہنم مرتب ہوتی ہے۔)

سورۃ الانشقاق - (۸۴)

(۱-۲) جب فضا میں پھیلی ہوئی توانائیاں پھٹ جائیں گی ۔۔ اور یہ کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوگا جو تمام کائنات کو نشو و نما دیتا ہے ۔۔ اُسی کے قوانین کے تابع یہ تمام سلسلۂ کائنات سرگرمِ عمل

ہے ۔ اُس نے اِسے بنایا ہی اس انداز سے ہے ۔

(۳-۵) اور زمین میں دور دور تک آبادیاں پھیل جائینگی ۔ اور وہ اپنی معدنیات اور دیگر ذخائر اُگل دے گی ۔ اور اندر سے خالی ہوتی جائے گی ۔ یہ بھی خدا کے قانون ہی کے مطابق ہوگا جس کی اطاعت ان اشیائے فطرت کا فریضہ ہے ۔ وہ بنائی ہی اس طرح گئی ہیں ۔

(۶) اے انسان! تو تنہا اپنے مشاہدات اور تجارب کی بنا پر رفتہ رفتہ، اُس نظامِ خداوندی تک پہنچ تو جائے گا جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ضامن ہے لیکن بڑی جانکاہ مشقتوں اور استخواں شکن ٹھوکروں کے بعد ۔ (اس کے برعکس، وحی کی راہ نمائی میں اس منزل تک بلا مشقت اور بڑے کم وقت میں پہنچا جا سکتا ہے)

(۷-۸) اس سلسلہ میں یہ اصول یاد رکھو کہ وحی کا اتباع کرنے والے کے اعمال، یُمن وسعادت کے حامل ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کے معاملات بڑی آسانی سے طے پا جاتے ہیں ۔

(۹) اور وہ اپنے رفقاء کی طرف خوشی خوشی لوٹ کر آتا ہے (اُسے ان لوگوں کیساتھ مل جانے میں، جو اُسی قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ یہ سب ایک دوسرے سے شاداں وفرحاں ملتے ہیں ۔ اور یوں ایک حسین وشاداب عالمگیر برادری وجود میں آجاتی ہے ۔)

(۱۰-۱۲) لیکن جو شخص اسلاف پرستی کی اندھی تقلید کی روش اختیار کرتا ہے، جس سے اُسے اپنا پچھلا راستہ تو روشن دکھائی دیتا ہے اور سامنے کا راستہ تاریک ۔ تو وہ تباہیوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتا ہے اور یوں جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔

(۱۳-۱۴) وہ اس سے پہلے اپنے ہم خیال لوگوں میں خوش خوش رہتا تھا ۔ اور اس کا خیال یہ تھا کہ اس کی حالت میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی ۔ وہ اسی طرح اپنی من مانی کرتا رہے گا ۔ اس کی قوت وشوکت میں کبھی کمی واقعہ نہیں ہوگی ۔

(۱۵) لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ خدا کا قانونِ مکافات اُس کی ہر نقل وحرکت پر نگاہ رکھتا ہے اور اُس کا مستقبل اُس کے اعمال کے نتائج کی رُو سے مرتب ہوگا (غلط روش پر چلنے والے کو کچھ وقت کے لئے تو مفادِ عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے)

(۱۶) اس حقیقت پر نظامِ کائنات شاہد ہے ۔ مثلاً تم ذرا غور کرو کہ سورج غروب ہو جاتا ہے تو اِس طرف بسنے والوں کی نگاہوں سے اس کی روشنی اوجھل ہو جاتی ہے لیکن شفق کی سرخی کچھ دیر تک بھی باقی رہتی ہے ۔

(۱۷) پھر رفتہ رفتہ یہ سرخی بھی ختم ہو جاتی ہے اور رات کی تاریکی کی چادر فضا پر چھا جاتی ہے جس میں تمام چیزیں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ اسی تاریکی کی چادر سے روشن ستارے اور چمکتا ہوا چاند نمودار ہو جاتے ہیں۔

(۱۸) اور چاند آہستہ آہستہ، اپنی منازل طے کرتا ہوا کامل بن جاتا ہے۔

(۱۹) یہ کائناتی مظاہر اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ تم بھی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے، یوں بلندیوں کی طرف اٹھتے جاؤ گے کہ جب اس کی ایک منزل کے ساتھ مطابقت حاصل کر لو گے تو اس سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو جاؤ گے (اور یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا)

(۲۰) حیرت ہے کہ اس قدر واضح دلائل و شواہد کے باوجود، یہ لوگ نہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان لاتے ہیں، نہ حیاتِ اُخروی پر، جو زندگی کی مزید ارتقائی منازل کا دوسرا نام ہے۔

(۲۱) اور جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔

(۲۲) بلکہ اس کی صداقتوں سے انکار کرتے اور اس کے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔

(۲۳) (اور یہ سب اس لئے کہ اس سے ان کے انفرادی مفاد پر زد پڑتی ہے۔ لیکن) یہ بات خدا پر خوب روشن ہے کہ یہ لوگ کیا جمع کرتے، اور پھر کس طرح اُسے صرف اپنے آپ پر صرف کرنے کے لئے تجوریوں میں بند کر کے رکھتے ہیں۔ (۹/۳۴)

(۲۴) (اے رسول!) انہیں متنبہ کر دے کہ اس روشِ زندگی کا نتیجہ بڑا الم انگیز ہوتا ہے۔ (۹/۳۵-۳۴)

(۲۵) اس تباہی سے وہی لوگ بچ سکیں گے جو خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھ کر انسانیت اور خود اپنی ذات، کو سنوارنے والے کام کریں گے۔ اُس طرزِ زندگی کا نتیجہ ایسی آسائشیں اور راحتیں ہوں گی، جن کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوگا (۴۱/۸-۲۵/۴۴) اور یہ کچھ انہیں بطور "احسان" (خیرات) نہیں ملے گا بلکہ وہ اسے بطور اپنے حق کے حاصل کریں گے۔

سُورۃ البروج (۸۵)

(۱) اس حقیقت پر شاہد ہیں۔
فضا کی بلندیوں میں نمایاں ہونے والے ستاروں کے مواقع اور منازل۔

(۲) اور وہ انقلاب جس کے آنے کا وعدہ (قرآن میں) بار بار مذکور ہے۔

(۳) اور یہ رسولؐ جو اس انقلاب کی شہادت دیتا ہے اور خود وہ نظام جس کے قیام و استحکام کی شہادت دی جاتی ہے۔

(۵-۴) کہ یہ لوگ جو اس نظام کی اس طرح مخالفت کرتے ہیں کہ اسے مٹانے کے لئے جنگ تک کی تیاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنی تدبیروں کی خندقیں کھودتے اور ان میں فتنوں کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔

(۶) اور اپنے اس پروگرام پر جم کر بیٹھے رہتے ہیں۔

(۷) اور جو کچھ دوسرے لوگ جماعتِ مومنین کے خلاف کرتے ہیں، یہ اسے بھی تماشا سمجھ کر دیکھتے رہتے ہیں۔

یہ سب آخر الامر تباہ ہو کر رہیں گے۔

(۸) یہ لوگ جماعتِ مومنین سے محض اس بات کا انتقام لینا چاہتے ہیں کہ وہ خدائے حمید و عزیز پر ایمان کیوں لے آئے ہیں۔ (۵۹ : ۲۲)

(۹) اُس خدا پر ایمان کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب اقتدار و اختیار اُسی کا ہے۔ اور ہر شے اُسی کی نگرانی کے اندر ہے۔

(۱۰)۔ (ان سے کہدو کہ) جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو اس طرح ایذا دیتے ہیں اور اپنی اس روش سے باز نہیں آتے، ان کے لئے سوزناک عذاب ہوگا ——— یعنی وہ عذاب جو ان کا سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیگا۔

(۱۱) ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لا کر اُس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل ہوتے ہیں، ان کے لئے (دنیا اور آخرت میں) اُس جنت کی زندگی ہے جس کی تازگی اور شادابی میں کبھی کمی نہیں آئے گی ——— یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

(۱۲)۔ (ان مخالفین سے کہدو کہ) خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

(۱۳) وہ ہر شے کو، اس کے نقطۂ آغاز سے پیدا کرتا اور پھر اسے، گردشیں دیتا ہوا، مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

(۱۴) اسی لئے وہ اشیائے کائنات کی تخریبی عناصر سے حفاظت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بننا ہے بن جائیں۔

(۱۵) اس مقصد کے لئے کائنات کے مرکزی کنٹرول کو، جو بڑی قوتوں اور عظمتوں کا مالک ہے، اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

(۱۶) اس میں صرف اسی کا اختیار و ارادہ کار فرما ہے۔ اور اس کا یہی وہ اختیار و ارادہ ہے جس کے مطابق وہ اشیائے کائنات کے لئے ضروری قوانین مرتب کرتا ہے۔ اس معاملہ میں کوئی اور دخل نہیں دے سکتا کہ کس چیز کے لئے کونسا قانون ہونا چاہیئے، اس کا فیصلہ وہ خود ہی کرتا ہے۔ (ان غیر متبدل قوانین کو خدا کی مشیت کہا جاتا ہے)

(۱۷) (اسی کا قانون انسانی دنیا میں، مکافاتِ عمل کی شکل میں کارفرما ہے۔ اس کی شہادت کے لئے، قرآن میں) ان لوگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ، قوانینِ خداوندی کی مخالفت کے لئے ہجوم کر آتے تھے۔

(۱۸) یعنی قوم فرعون' اور قوم ثمود کے لوگ ــــ (ان کا جو انجام ہوا وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے)

(۱۹)۔ (لہٰذا اے رسولؐ) یہ لوگ جو اس وقت' ہمارے قوانین سے انکار کرتے اور اسے جھٹلاتے ہیں ان سے کہہ دو کہ

(۲۰) خدا کا یہی قانون انہیں آگے پیچھے (ہر طرف) سے گھیرے ہوئے ہے۔

(۲۱) انہیں معلوم نہیں کہ یہ جس ضابطہ خداوندی (قرآن) کی مخالفت کر رہے ہیں' وہ کتنے بڑے شرف و مجد کا حامل ہے۔

(۲۲) وہ ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ رہنے والی تختی پر کندہ ہے (وہ صحیفۂ کائنات میں بھی محفوظ ہے اور قرآن کے اوراق میں بھی۔ اس لئے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا) (۹/۱۵)۔ (خدا کے غیر متبدل قوانین، خواہ وہ نظامِ فطرت سے متعلق ہوں اور خواہ انسان کی تمدنی دنیا سے، کبھی مٹ نہیں سکتے۔ اول الذکر کو قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کو قرآن کا ضابطۂ حیات)

سُوْرَةُ الطَّارِق (۸۶)

(۱) فضا کی بلندیاں اور "طارق" ایک عظیم حقیقت پر شاہد ہیں۔

(۲) تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ "طارق" کی شہادت سے کیا مقصود ہے یعنی

(۳) اس نہایت روشن ستارے کی شہادت سے جو رات کی تاریکیوں میں قندیل نورانی بن کر آتا ہے۔

(وہ نظر تو آتا ہے رات ہی کو۔ لیکن دن کے وقت وہ مٹ نہیں جاتا، موجود رہتا ہے۔ صرف اس کی روشنی ہماری نظروں سے پنہاں ہوتی ہے۔

(۴) یہی صورت انسانی اعمال کی ہے۔ انسان اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے سمجھتا ہے کہ اس کے جو اعمال دوسروں کی نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں' ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے ان پر گرفت کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ خیال خام ہے۔ اعمال' خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ' ہمیشہ موجود رہتے ہیں)۔ ہم نے ہر فرد کے اعمال کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر رکھا ہے۔

(۵) (وہ اسی طرح کبھی پنہاں ہوتے ہیں اور کبھی ظاہر جس طرح زندگی' کبھی مضمر ہوتی ہے کبھی مشہود۔ اگر انسان اس ایک نکتہ پر غور کرے' تو اس کے لئے بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ رہے۔ مثلاً وہ دیکھے کہ اس کی پیدائش کس طرح سے ہوتی ہے؟

(۶) اس کی ابتدا' اس مادۂ تولید سے ہوتی ہے جو اچھل کر رحم میں گرتا ہے۔

(۷) وہ اپنے مقام تولید سے سیدھا عورت کے رحم میں نہیں جا گرتا وہ مرد کی پیٹھ اور پسلیوں کے اندر سے ہوتا ہوا اپنے مستقر میں پہنچتا ہے۔ (اس مادۂ تولید میں زندگی مضمر شکل میں ہوتی ہے۔ اور پھر رحم مادر کے اندر' مختلف منازل سے گزر کر' وہ مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے)۔

(۸) جو لوگ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا' ان سے پوچھو کہ اس میں ناممکن بات کون سی ہے؟ اس دنیا میں' زندگی مشہود ہوتی ہے۔ طبیعی موت کے بعد اتنا ہی فرق پڑتا ہے۔ کہ وہ پھر مضمر ہو جاتی ہے تو کیا وہ خدا جس نے اسے' اس سے پہلے مضمر سے مشہود بنایا تھا' اس پر قادر نہیں کہ ایک بار پھر مضمر کو مشہود کر دے؟ یقیناً وہ اس پر قادر ہے۔

(۹) اس وقت' جس طرح زندگی مضمر سے مشہود ہو جائیگی' اسی طرح انسانی اعمال کے پوشیدہ نتائج بھی بے نقاب ہو کر سامنے آجائینگے۔

(۱۰) اس وقت کوئی قوت ایسی نہیں ہوگی جو ان مخفی نتائج کو بے نقاب ہونے سے باز رکھ سکے۔ اور نہ ہی انسان کا کوئی ایسا مددگار ہوگا جو اسے ان نتائج کی تباہیوں سے بچا سکے۔

(۱۱) یہ تو رہا اُخروی زندگی کا ماجرا۔ اس سے پہلے' یہاں بھی ایک عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے اس کے لئے) اجرام فلکی کے نئے نئے پہلو جو ان کی گردش کی وجہ سے سامنے آتے ہیں۔

(۱۲) اور بیج کو پھاڑ کر، اس میں سے کونپل نکالنے والی زمین۔
(۱۳) غرضیکہ یہ تمام مظاہرِ فطرت جن میں تخریب و تعمیر کا یہ عمل مسلسل جاری و ساری ہے، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی میں بھی اُس انقلاب کا آجانا (جس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے) ایک طے شدہ بات ہے۔ (اس وقت اس کا پہلا تخریبی مرحلہ سامنے ہے۔ اس کے بعد یہ دانہ پھوٹ کر ایک نئے پودے کی شکل اختیار کرلے گا)۔ (۴۹/۹)
(۱۴) یہ ایک طے شدہ بات ہے کوئی لغو دعویٰ نہیں۔
(۱۵) یہ مخالفین اس کے روکنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔
(۱۶) لیکن ہمارا قانون بھی اس سے غافل نہیں۔ وہ بھی اپنی تدابیر میں مصروف ہے۔
(۱۷) بات صرف مہلت کے وقفہ کی ہے۔ سو تو ان مخالفین کو سردست ان کے حال پر چھوڑ دے۔ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق انہیں تھوڑی سی مہلت مل رہی ہے۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوگی اور وہ انقلاب آجائے گا۔

سورۃ الاعلیٰ (۸۷)

(۱) (اے رسولؐ!) تو اپنے نشو و نما دینے والے کے بلند و بالا نظامِ ربوبیت کو متشکل کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہ۔ (۵۶/۹۶)
(۲-۳) اُس خدا کے نظامِ ربوبیت کو متشکل کرنے کے لئے جو ـــ
(i) ہر شے کو مختلف امتزاجات اور تراکیب سے ایک ہیئت عطا کرتا ہے۔
(ii) پھر اس کے حشو و زوائد کو دور کرکے، اس میں خاص تناسب اور اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔
(iii) پھر اس میں ایک خاص اندازے اور پیمانے کے مطابق، ایک حد تک بڑھنے، پھولنے، پھلنے کی صلاحیت رکھ دیتا ہے (اسے اُس شے کی تقدیر کہتے ہیں)
(iv) اس کے بعد اُسے وہ راستہ دکھا دیتا ہے جس پر چلنے سے وہ شے اپنی تکمیل تک پہنچ سکتی ہے (یہ راہنمائی کائنات کی ہر شے کے اندر رکھ دی جاتی ہے) اسے اس شے کی فطرت یا جبلت کہا جاتا ہے۔ اس طرح کائنات کی ہر شے، خدا کے قانون کے مطابق، منزل بمنزل اپنی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

(۴). (مثلاً) زمین میں تخم ریزی کی جاتی ہے' تو وہ دانہ' خدا کے قانون کے مطابق' ہرے بھرے چارہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے مویشیوں کی پرورش ہوتی ہے. لیکن

(۵) یہی چارہ' جب حیات بخش عناصر سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے یا اُس پہلے کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا تو وہ خشک ہو کر خس و خاشاک میں تبدیل ہو جاتا ہے (اس کی یہ زندگی، نمو، اور پھر موت' سب خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے جس کا علم ہر شے کے اندر رکھ دیا گیا ہے.)

(۶) (زندگی، نشوونما اور موت کا یہی قانون خود انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہے. لیکن اس قانون کا علم (اشیائے فطرت کی طرح) انسان کے اندر نہیں رکھ دیا گیا. یہ راہنمائی اُسے اُس وحی کے ذریعے ملتی ہے جو انبیاء کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتی ہے. یہ وحی' اے رسولؐ! ہم نے اس اہتمام سے تجھے دی ہے کہ) تو اس میں سے نہ کچھ بھول سکتا ہے، نہ ترک کر سکتا ہے.

(۷) اگر خدا کی مشیت ہوتی تو' تو اس میں سے کچھ بھول سکتا (اور ترک کر سکتا) تھا. لیکن' (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے (۱۷/۸۶). اس کی مشیت ایسی نہیں تھی. اس لئے تو اس میں سے کچھ بھی ترک یا فراموش نہیں کر سکتا. یہ حتمی بات ہے.

یہ وحی اُس خدا کی طرف سے دی گئی ہے جو جانتا ہے کہ انسان میں کیا کیا ممکنات زندگی مضمر ہیں. اور ان میں سے کس کس جوہر کی نمو کس انداز سے ہو سکتی ہے. (اس لئے ہماری یہ وحی' ہر طرح سے مکمل اور اس مقصد کے لئے کافی ہے جس کے لئے دی گئی ہے یعنی انسانی ذات کی نشوونما کے لئے).

(۸). یہی نہیں کہ تجھے وحی بھولے گی نہیں، اسے متشکل کرنے کے لئے ہم تیرے لئے آسانیاں بھی پیدا کر دینگے. اور یوں تو' آہستہ آہستہ اس نظام کو تکمیل تک پہنچا دے گا.

(۹) سو تو اس وحی کو لوگوں کے سامنے پیش کئے جا. لیکن جب تو دیکھے کہ جس شخص یا گروہ کو تو نصیحت کر رہا ہے وہ اس سے مستفید ہونا ہی نہیں چاہتا' تو اُسے چھوڑ دے (اور یہی وقت اور توانائی ایسی جگہ صرف کر جہاں تیری تعلیم نتیجہ خیز ہو.)

(۱۰) اس لئے کہ اس سے وہی شخص فائدہ اٹھائے گا جو عاقبت اندیش ہوگا جسے اپنے نفع نقصان کا خیال ہوگا. جو غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہے گا. (۲/۲)

(۱۱) جو شخص اس سے کنارہ کش رہیگا وہ تیرا یا کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑے گا. وہ خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہے گا. اور یوں بڑا بدقسمت ہوگا.

(۱۲) وہ تباہیوں کے اس جہنم میں داخل ہوگا جو سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔

(۱۳) اس میں انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ مرتا ہی ہے (کہ یوں اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جائے) اور نہ ہی اس کا شمار زندوں میں ہوتا ہے۔ (۸۷/۱۳)

(۱۴)۔ (یاد رکھو!) کھیتی اسی کی پروان چڑھتی ہے جو (اپنے جسم کی پرورش ہی کو نصب العین حیات قرار نہ دے لے بلکہ اس کے ساتھ) اپنی ذات کی نشوونما بھی کرے۔

(۱۵) اور ذات کی نشوونما اُس کی ہوتی ہے جو خدا کی صفتِ ربوبیت کو عملاً متشکل کرتا ہے۔ اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

(۱۶-۱۷)۔ (ان مخالفین سے کہو کہ اس کے برعکس تمہاری یہ حالت ہے کہ) تم طبیعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ مستقبل کے مفاد اُن سے کہیں بہتر ہیں۔ اور غیر متبدل (یعنی جب جسم کے تقاضوں اور مستقل اقدار میں تصادم ہو تو صحیح روش یہ ہے کہ مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضوں کو قربان کر دیا جائے۔ اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور اُخروی زندگی کامیاب)

(۱۸) یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن میں پہلی بار بیان نہیں کیا گیا، سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی یہی پیغام دیا گیا تھا۔ (مثلاً) جو کتاب ابراہیمؑ کو دی گئی تھی اس میں بھی یہی تعلیم تھی۔ اور جو موسےٰؑ پر نازل ہوئی تھی اس میں بھی یہی کچھ کہا گیا تھا۔ (۸۷/۱۸-۱۹)۔ دین کی اصل و بنیاد شروع سے ایک ہی چلی آرہی ہے۔

سُورَۃُ الغَاشِیَۃ (۸۸)

(۱) ہم تمہیں اس عالمگیر انقلاب کے متعلق کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ جو ان تمام لوگوں پر چھا جائے گا (جو اس سے بچنے کی تدبیریں کر رہے ہیں)

(۲) اس وقت انسانوں کے دو گروہ ہو جائیں گے۔ ایک گروہ ان کا جن پر افسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی ہوگی — ذلیل و خوار، نادم و محجوب۔

(۳) ان کی محنت و مشقت کا ماحصل سوائے تکان اور اضمحلال کے کچھ نہ ہوگا۔ (اس لئے کہ انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اور غلط راستے پر چلنے والے کے حصے میں تکان اور اضمحلال کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔ وہ تھکتا ہے لیکن منزل تک نہیں پہنچتا۔)

(۴) ان کی غلط روش انہیں تباہیوں کے جہنم میں لے جائے گی جس کے شعلے تیزی سے بھڑک رہے ہونگے۔

(۵) اُس جہنمی زندگی میں انہیں پینے کو کھولتے ہوئے چشمے کا پانی ملے گا جس سے پیاس بجھنے کے بجائے اور بھڑک اٹھے۔

(۶) اور کھانے کو وہ بدبودار جھاڑیاں جنہیں سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔ (یعنی وہ بھیک کے ٹکڑے جنہیں بڑی بڑی قومیں ردی سمجھ کر پس ماندہ اقوام کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ ایسی ذلت کی روٹی)

(۷) جس سے جسم کا نشو ونما حاصل کرنا تو ایک طرف، بھوک بھی نہ مٹے۔

(۸) ان کے برعکس، دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گا جنہیں زندگی کی آسائشیں حاصل ہونگی۔

(۹) یعنی وہ اپنی جدوجہد کے نتائج کی طرف سے بالکل مطمئن ہونگے۔

(۱۰) وہ ایک ایسے جنتی معاشرہ میں ہونگے جو ان کے مقامِ بلند کا آئینہ دار ہو گا۔ اس میں انہیں، آسائشوں کے ساتھ، ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں بھی حاصل ہونگی۔

(۱۱) اس میں وہ کوئی لغویات سننے نہیں پائیںگے۔

(۱۲) انہیں، زندگی کی جوئے رواں سے، آبِ حیات پینے کو ملے گا۔ (۱۲–۸۸)

(۱۳) وہ اختیارات و اقتدارات کے بلند و بالا تختوں پر متمکن ہوں گے۔

(۱۴) پینے کے لئے نہایت عمدہ گلاس، قرینے سے رکھے ہوئے۔

(۱۵)-(۱۶) بیٹھنے کے لئے قطار در قطار تکیے اور اعلیٰ درجہ کے قالین بچھے ہوئے۔

(۱۷)- یہ بات کہ جو معاشرہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہو گا وہ کس حسن و خوبی سے اپنے زندگی بخش نتائج پیدا کرتا جائے گا، اس کی سمجھ میں آسکتی ہے جو یہ دیکھے کہ نظامِ کائنات —— جو قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے —— کس عمدگی سے چل رہا ہے اور کیسے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے) انہیں چاہیئے کہ دیکھیں کہ

(i) یہ پانی سے بھرے ہوئے بادل کس طرح ترکیب پاتے ہیں؛ سمندر کا تلخ پانی کس طرح صاف، شفاف، میٹھے پانی کے مشکیزوں میں تبدیل ہو جاتا ہے جو دوشِ ہوا پر سوار، اِدھر اُدھر، تیرتے پھرتے ہیں۔

(۱۸) (ii) یہ ایسے ایسے عظیم الجثہ، اجرامِ فلکی، کس طرح فضا کی بلندیوں میں معلق ہیں۔

(۱۹) (iii) یہ اتنے اتنے بڑے پہاڑ کس انداز سے مستحکم کھڑے ہیں (حالانکہ زمین اس تیزی

سے گردش کر رہی ہے)

(۲۰)۔(۲۰) اور خود یہ زمین کس حسن و خوبی سے بچھا دی گئی ہے (کہ تمہیں اس کی گولائی کا احساس تک نہیں ہوتا)۔

(۲۱) (ان مظاہر فطرت کی طرف توجہ دلانے کے بعد) تو ان کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کر۔ اس لئے کہ تیرا کام، اس تعلیم کو پیش کرنا ہے۔

(۲۲) اسے ان سے زبردستی منوانا نہیں۔ تو ان پر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجا گیا۔

(۲۳) تو اس قرآن کو ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس کے بعد جو شخص اس سے اعراض برتے گا، اور اس کے مطابق چلنے سے انکار کرے گا،

(۲۴) تو وہ (خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق) زندگی کے بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو جائیگا۔

(۲۵)۔ (اس لئے کہ جو لوگ قانونِ مکافات سے انکار کر دیتے ہیں، یہ اس کی زد سے بچ نہیں سکتے) ان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ کسی دوسری طرف جا ہی نہیں سکتے۔

(۲۶) لہٰذا، ان کے تمام اعمال کا حساب اسی قانون کے مطابق ہوگا۔ اور ایسا ہو کر رہے گا۔

سُورَۃ الفَجر (۸۹)

(۱-۴) (حج کا اجتماع، نوعِ انسان کے الجھے ہوئے معاملات کو سنوارنے کے لئے، ایک عظیم تقریب کے طور پر تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن اِن لوگوں (عرب جاہلیہ) کو دیکھو کہ انہوں نے اس تقریب کو کیا سے کیا بنا دیا ہے)۔ انہوں نے، اس اجتماع کی ابتدائی دس راتوں کو رنگ رلیاں منانے کے لئے وقف کر رکھا ہے ان میں ہر قسم کی بدمستیاں کرتے ہیں، ہر طرف جوئے کا بازار گرم ہوتا ہے، جو طاق اور جفت (پانسوں) سے کھیلا جاتا ہے۔ آخری رات ان کی عیش پرستیاں انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور پھر، صبح کو اٹھ کر اس طرح سے یہ حج کی تقریب مناتے ہیں۔ وہ بھی ان کی بدمستی اور فحاشی کی چلتی پھرتی تصویر ہوتی ہے۔ قریش کے سرمایہ دار تاجر، اور کعبہ کے متولی، یہ سب کچھ دولت اور قوت کے نشے میں بدمست ہو کر کرتے ہیں۔ یہ دولت کو اس طرح لٹاتے ہیں، اور ان کے اردگرد غریب روٹی کے ٹکڑے تک کو ترستے ہیں)

(۵) جو شخص ذرا بھی عقل و فکر سے کام لے گا، وہ بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ ان لوگوں کا

انجام بھی ویسا ہی ہونے والا ہے' جیسا انجام' انہی جیسی اقوامِ سابقہ کا ہوا تھا۔

(۶)۔ (مثلاً) قومِ عاد کا جو ارم کی اولاد میں سے تھے۔

(۷) انہیں قابلِ اعتماد سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل تھا۔ (۲۶/۱۳۲-۱۳۴)۔ وہ بڑی بڑی عمارات بناتے اور اپنی بلند یادگاریں تعمیر کرتے تھے۔ (۲۶/۱۲۸)

(۸) انہیں اپنی ہم عصر اقوام میں بے نظیر مقام حاصل تھا۔

(۹) اور قومِ ثمود کا، جو پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتی تھی۔ (۹/۱۵)

(۱۰) اور بڑی محکم قوتوں کے مالک' فرعون کا انجام' جس کے مملکت میں کھونٹے گڑے ہوئے تھے۔

(۱۱-۱۲) ان لوگوں نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی' اور فساد انگیزی میں حدود فراموش ہو گئے تھے۔

(۱۳) تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ تیرے نشوونما دینے والے کا قانونِ مکافات' ان پر طرح طرح کے عذاب لایا' اور وہ سب تباہ و برباد ہو گئے۔

(۱۴) اس لئے کہ اس کا قانونِ مکافات' ہر ایک کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ کسی کا کوئی عمل' اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ (لہٰذا' جو انجام اُن لوگوں کا ہوا تھا' وہی ان سردارانِ عرب کا ہوگا جو اپنی بدمستیوں میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں)

(۱۵) اصل یہ ہے کہ جب انسان وحی کی روشنی سے منہ موڑ لیتا ہے' اور عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے' تو قانون کا تصور ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قانون کے تصور سے مراد یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے' وہ انسان کے کسی نہ کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن ایسا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہر بات یونہی اتفاقی طور پر واقع ہوتی ہے۔ اس کی اس غلط نگہی کا نتیجہ ہے کہ (مثلاً) جب کسی کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ' یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ" یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عزت اور آسائش عطا کر دیتا ہے"۔

(۱۶) جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس کی کس غلط روش کا نتیجہ ہے۔ وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ' ناحق' بلا سبب' ذلیل و خوار کر دیا۔

(۱۷) ایسا سمجھنے' والوں سے کہو کہ یہ غلط ہے۔ خدا کسی کو یونہی بلا وجہ ذلیل و خوار نہیں کیا کرتا۔ تم جو یوں ذلیل ہوتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی

عزت و توقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جائیں۔ وہی قابلِ عزت سمجھا جاتا تھا جس کی پارٹی زیادہ مضبوط ہو۔
جس کا جتھہ طاقتور ہو۔

(۱۸) اور اُس معاشرہ میں یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ جس کی چلتی گاڑی کسی حادثہ کی وجہ سے 'رک جائے'
وہ سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۱۹) اس کے برعکس تم کرتے یہ تھے کہ جو کچھ تمہارے باپ دادا سے تمہارے قبضے میں آجاتا، اسے
بھی سمیٹ کر کھا جاتے۔

(۲۰) اور اس کے ساتھ ایسی تدابیر کرتے رہتے کہ دوسروں کا مال بھی اِدھر اُدھر سے سمٹ کر اس
طرح تمہاری طرف کھنچ کر چلا آتے جس طرح وادی کا تمام پانی نشیب زمین کی طرف بہ کر آجاتا ہے۔ (یعنی
ایسا نظامِ سرمایہ داری جس میں چھوٹے چھوٹے سرمائے، سب بڑے سرمایہ کے اندر جذب ہوتے چلے جائیں
اور اس طرح دولت چند افراد کے پاس مرتکز ہو کر رہ جائے۔ اس قسم کا نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ
وجہ ہے کہ تم اس قدر ذلیل و خوار ہو گئے ہو۔ ہمارے ہاں سے 'عزت و تکریم' نہ یونہی اندھا دھند ملتی ہے
نہ اندھا دھند چھنتی ہے۔ وہ بھی انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اس کے اعمال کا نتیجہ)

(۲۱)، (لہٰذا اِن سردارانِ قریش سے کہدو کہ تمہارا یہ نظام بھی ہمیشہ کے لئے باقی نہیں رہ سکتا،
وہ دَور آنے کا) جب اس اونچ نیچ کو مٹا کر، معاشی ہمواریاں پیدا کر دی جائیں گی۔

(۲۲) اور جب خدا کا نظامِ ربوبیت، کائناتی قوتوں کو صف درصف اپنے جلو میں لئے، متمکن ہو
جائے گا۔ (اس وقت، فطرت کی قوتوں کا ماحصل، کسی خاص قوم کی قوت اور دولت میں اضافہ کرنے
کے بجائے عالمگیر انسانیت کی نشو ونما کے لئے وقف ہوگا)۔

(۲۳) اور وہ جہنم، جو غلط معاشی نظام کا فطری نتیجہ ہے، اور جسے انہوں نے اس وقت اپنی فریب کاریوں
اور مہرہ بازیوں سے دبا رکھا ہے، اُبھر کر سامنے آجائے گا۔ اُس وقت یہ لوگ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے
چاہیں گے کہ قانونِ خداوندی کی اطاعت اختیار کر لیں۔ لیکن اُس وقت (جب نتائج سامنے آجائیں گے)
ان کی یہ آرزو انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکے گی۔

(۲۴) اُس وقت انسان، بصد حسرت و یاس پکار اُٹھے گا کہ اے کاش! میں نے بھی اس سے پہلے
وہ کچھ کیا ہوتا، جو مجھے آج حقیقی زندگی عطا کر دیتا۔

(۲۵) اُس دن آسے خدا کی طرف سے وہ عذاب ملے گا جس کی مثل کوئی اور عذاب نہیں۔

(۲۶) اور اُس کی طرف سے ایسی گرفت ہوگی جس کی نظیر کوئی گرفت نہیں۔

(۲۷) اس کے برعکس، وہ شخص جس نے قانونِ خداوندی کے اتباع سے، سکونِ گہر کی طرح دل کا صحیح اطمینان حاصل کر لیا ہوگا (۲۷/۸۹)، اس سے کہا جائے گا کہ

(۲۸) تیرا طریقِ زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا، اس لئے تیری زندگی خوشگوار اور پسندیدہ ہوگی، تجھے تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے حسبِ منشا آسائشیں حاصل ہونگی۔

(۲۹) (لیکن انہیں متنبہ کر دو کہ یہ چیز انفرادی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی، اجتماعی زندگی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ) تو ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جائے، جنہوں نے خدا کی حکومت اختیار کر رکھی ہے۔

(۳۰) اور اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جائے جو اسکے قانون کیمطابق متشکل ہوا ہے ($\frac{9}{119}$) (اس دنیا میں بھی جنتی زندگی اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔)

سورۃ البلد (۹۰)

(۱-۲) اے رسولؐ! تو ان مخالفین سے، جو تجھے اس شہر مکہ میں اس قدر تکالیف پہنچا رہے ہیں اور اس کی حرمت کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے، کہدے کہ (تم جو میرے، اور اس نظام کے متعلق خیال کئے بیٹھے ہو کہ یہ ناکام رہے گا) ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

(۳) میں خود اس شہر مکہ کی حرمت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ اور اس قانونِ تولید کو جس کی رُو سے ہر آن، پرانی زندگی (باپ) سے ایک نئی زندگی (بیٹے) کی نمو ہوتی رہتی ہے کہ یہی شہر آخر الامر، تمہارے باطل نظام کی جگہ صحیح نظامِ خداوندی کا مرکز بن کر رہے گا۔

(۴) بات یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا اس لئے کیا تھا کہ وہ (وحی کے تابع رہ کر) ایک متوازن زندگی بسر کرے اور اس طرح خود اپنی ذات میں توازن و تناسب پیدا کرے۔ (لیکن اس میں چونکہ مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے)

(۵) اس لئے وہ، بجائے اس کے کہ ہماری وحی کے تابع زندگی بسر کرے، سمجھ یہ بیٹھتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی قوت ہے ہی نہیں جس کے قوانین کی اطاعت اسے کرنی چاہیئے وہ اپنے آپ کو اقتدارِ اعلیٰ کا مالک سمجھ لیتا ہے۔

(۶) (وہ اس زعم باطل میں مبتلا رہتا ہے اور ہمارے قوانین کی مخالفت میں اپنا مال صرف کرتا رہتا ہے۔ لیکن) آخر الامر دیکھ لیتا ہے کہ اس کی تدبیریں کس طرح ناکام رہ گئیں۔ وہ اس وقت کف افسوس ملتا ہوا کہتا ہے کہ میں نے خواہ مخواہ اس قدر مال ضائع کر دیا۔
(۷) کیا ایسا انسان یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے، اس پر کسی کی نگاہ ہی نہیں! کوئی اس سے پوچھنے والا ہی نہیں!
(۸) یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ ہم نے اُسے ذرائع علم عطا کئے ہیں ۔ دو آنکھیں ۔
(۹) زبان اور دو ہونٹ۔ کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جہاں ضرورت پڑے، دوسروں سے پوچھے۔
(۱۰) اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے وحی کے ذریعے، صحیح اور غلط راستے، اُبھار اور نکھار کر بتا دیئے ہیں۔
اس سے، اس پر اس کے اعمال کی ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ اور یہی مطلب ہے یہ کہنے کا کہ اسے کوئی دیکھنے والا بھی ہے۔ اور اس پر کسی کو قدرت بھی حاصل ہے۔
(۱۱) ان دو راستوں میں سے ایک راستہ ذاتی مفاد پرستی کا ہے۔ یعنی جس طریق سے بھی ہو سکے، دوسروں کی محنت کا ماحصل غصب کر لینا، اور یوں تن آسانی اور عیش کوشی کی زندگی بسر کرنا۔ انسان کی عقل حیلہ جو اس سے کہتی ہے کہ یہ راستہ بڑا آسان ہے۔ اُسے اسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔
اس کے مقابلہ میں دوسرا راستہ بڑا محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ہے جس میں قدم قدم پر انسان کی سانس پھول جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں ہر قدم انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔
(۱۲) یہ پہاڑ کی گھاٹی والا راستہ کیا ہے؟ اسے تمہیں خدا سے بہتر اور کون سمجھا سکتا ہے۔ سنو!
(۱۳) یہ راستہ یہ ہے کہ انسان صرف اپنی فکر ہی نہ کرے، بلکہ جہاں دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے، اُسے اس سے آزاد کرائے۔ یعنی سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم، مطیع اور زیر دست نہ رہے۔ ہر ایک گردن اٹھا کر چلے، ہر ایک کو جسمانی، ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو۔ (اس پر قوانین خداوندی کے علاوہ، کسی کی پابندی نہ ہو)
(۱۴)۔(۱۶) دوسرے یہ کہ جس دور میں مستبد قوتیں، رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے کر عوام کے لئے بھوک اور درماندگی کو عام کر دیں، وہ اُن لوگوں کے رزق کی فکر کرے جو معاشرہ میں، ہزارہا

انسانوں کے قریب رہتے ہوتے بھی، اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کریں۔ یا اُن لوگوں کے رزق کا جنہیں اس حالت تک پہنچا دیا گیا ہو کہ وہ محض روٹی کی خاطر مٹی میں رُلتے ہیں (یعنی سرمایہ داروں کے محتاج رہ کر اُن کے لئے محنت و مشقت کے کام کرتے رہیں)

(۱۷) یہ راستہ بڑا دشوار گذار اور یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ لیکن اس پر چل کر، انسان، اُن لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے جو خدا کے نظامِ ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ وہ بھی اس باب میں ثابت قدم رہیں اور خدا کے عطا کردہ سامانِ نشو ونما میں ہر ایک کو شریک رکھیں۔

(۱۸) یہ اُن لوگوں کا گروہ ہے جو صاحبِ یُمن و سعادت ہیں۔ انہیں ہر قسم کی برکات حاصل ہونگی۔

(۱۹) ان کے برعکس، جو لوگ ہمارے قوانین سے انکار کرکے، تن آسانی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اُنکے حصے میں مصیبتیں اور محرومیاں آتی ہیں۔

(۲۰) یہ اس جہنمی معاشرہ میں رہتے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ (اس دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی)

سُورۃ الشمس (۹۱)

(۱) اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

آفتاب جہاں تاب اور اُس کی ضیاباریاں۔

(۲) چاند، اور اس کا روشنی حاصل کرنے کے لئے سورج کے پیچھے پیچھے پھرنا۔

(۳) دن، اور اس کی جلوہ فروشیاں۔

(۴) رات، اور اس کی ظلمت انگیزیاں، جو ہر شے کو اپنی تاریکی کی چادر میں لپیٹ لیتی ہیں۔

(۵) فضا کی بلندیوں میں اجرامِ فلکی اور جس انداز سے انہیں بنایا گیا ہے۔

(۶) زمین اور گول ہونے کے باوجود اُس کا اس طرح پھیلا ہوا اور کشادہ ہونا۔

(۷) اور خارجی کائنات سے نیچے اُتر کر، خود انسانی ذات، اور جس انداز سے اسے متوازن اور ہموار بنایا گیا ہے۔

(۸) پھر اس کے اندر جس اندازے اس بات کی صلاحیت اور امکانی وسعت رکھ دی گئی ہے کہ یہ چاہے تو غلط روش پر چل کر اپنے اندر انتشار¹ پیدا کرے اور چاہے اس انتشار سے محفوظ رہے۔

(۹)۔ (انفس و آفاق میں کارفرما یہ تمام قوانین اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ) جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی، وہ کامیاب و کامران ہو گیا۔ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔

(۱۰) لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور اُبھرنے نہ دیا، اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلۂ زندگی افسردہ ہو گیا۔ وہ اس چقماق کی طرح ہو گیا جس سے چنگاری کی نمود نہ ہو اور وہ پتھر کا پتھر رہ جائے۔

(۱۱) (اس حقیقت پر تاریخی واقعات بھی شاہد ہیں۔ مثلاً) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اس قانون کو جھٹلایا۔

(۱۲) اور ان میں سے وہ شخص، اس کی مخالفت کے لئے نمایاں طور پر سامنے آیا جو ان میں سب سے زیادہ بدنصیب تھا۔

(۱۳) اُن کے رسول نے ان سے کہا تھا کہ خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو 'ربوبیتِ عامہ' کے لئے کھلا رہنے دو ـــــ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس اونٹنی کو ـــــ جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی ہے ـــــ اسے اس کی باری پر پانی پینے دو۔

(۱۴)۔ انہوں نے اس بات کا وعدہ کر لیا لیکن پھر اپنے قول اقرار سے پھر گئے۔ اور اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ (اور یوں ثابت کر دیا کہ وہ خدا کے نظامِ ربوبیت کی مخالفت سے باز نہیں آئیں گے۔)

(۱۵) تو ان کی اس روش کے نتیجہ میں، خدا کے قانونِ مکافات کا دمدمہ آیا۔ اور انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔ (انہیں پیس کر خاکِ راہگذر بنا دیا)

(۱۶) اور ایسا کرتے وقت وہ اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبرایا کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ اس لئے کہ یہ بات، ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی بلکہ اُن کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آ گیا (لہٰذا، اُس قانون کے لئے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے۔)

---

1. DISINTEGRATION OF HUMAN PERSONALITY.

سورۃ اللیل (۹۲)

(۱) تم سلسلۂ کائنات پر غور کرو۔ بادی النظر میں یہ تمہیں متضاد عناصر کا مجموعہ نظر آئے گا۔ مثلاً ایک طرف رات ہے کہ اس کی تاریکی ہر شے پر پردے ڈال دیتی ہے۔ تو

(۲) دوسری طرف دن ہے جس کا اُجالا، ہر شے کو اُبھار کر سامنے لے آتا ہے۔

(۳) جانداروں میں ایک طرف نر ہیں تو دوسری طرف مادہ، جن کے طبیعی وظائف زندگی مختلف ہیں۔

(۴) یہ سب تضاد، تقسیم عمل کے لئے ہے۔ اسی تقسیم عمل کا نتیجہ ہے کہ تمہاری تمدنی زندگی میں تمہاری سعی و عمل بھی مختلف سمتوں میں ہوتی ہے۔ اسی سے یہ مشینری بایں حسن و خوبی سرگرم کار رہتی ہے۔

(لیکن اگر تم یہ سمجھ لو کہ اس تقسیم عمل سے خود انسانیت مختلف طبقات میں بٹ جاتی ہے۔ اور ایک فرد کو دوسرے فرد سے کچھ تعلق نہیں رہتا تو یہ تمہاری نگاہ کا فریب ہے۔ اگر رات اور دن کے اختلاف اور نر اور مادہ کے امتیاز کو سطحی نظر سے دیکھو تو یہ الگ الگ چیزیں دکھائی دیں گی لیکن اگر تم سطح سے ذرا نیچے اُتر کر دیکھو تو تمہیں صاف نظر آجائے گا کہ یہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یہ ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ اسی طرح تقسیمِ عمل کے باوجود، تمام نوعِ انسان ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔)

(۵) لہٰذا یاد رکھو۔ جو شخص تمام نوعِ انسان کو ایک وحدت سمجھ کر یہ روش اختیار کرتا ہے کہ اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے، اور اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے محتاط رہے۔ (۹۲/۱۹، ۱۸)

(۶) اور اس کے توازن کو حسن کارانہ انداز سے قائم رکھ کر اپنے اس دعوے کو عملاً سچ کر دکھائے (کہ تمام انسان اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہیں)

(۷) تو ہمارا قانونِ ربوبیت، اسے زندگی کے مراحل نہایت آسانی سے طے کراتے جاتا ہے۔

(۸) لیکن، اس کے برعکس جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے رکھ لیتا ہے، اور یہ خیال کر لیتا ہے کہ میں خود مکتفی اور دوسروں سے بے نیاز ہوں۔ مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے۔ (۸۰/۶ ؛ ۹۶/۷)

(۹) اور اس طرح، معاشرہ کے توازن کی عملاً تکذیب کر کے اسے بگاڑتا ہے۔

(۱۰) تو ہمارا قانونِ مکافات، زندگی کی آسان راہوں کو اس کے لئے دشوار بنا دیتا ہے۔

(۱۱) اور جب وہ اس طرح، تباہیوں کے گڑھے میں گر جاتا ہے تو وہ مال و دولت جس کے برتے پر اس نے اپنے آپ کو دوسروں سے مستغنی سمجھ رکھا تھا، اس کے کسی کام نہیں آتا۔ (۹۲/۴ ؛ ۱۱)

(۱۲) (اس نے یہ راستہ تنہا عقل کی رو سے اختیار کیا تھا۔ لیکن ...... عقلِ انسانی تو اسے پیش پا افتادہ انفرادی مفاد کا حصول اور تحفظ سکھاتی ہے۔ اس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتی)۔ اس باب میں صحیح راہ نمائی صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہے۔

(۱۳) اس لئے کہ وحی کے سامنے انسان کے پیش پا افتادہ مفاد عاجلہ بھی ہوتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریاں بھی۔ (۹۲/۱۳)

(۱۴) لہٰذا، جو لوگ ہماری وحی کی راہ نمائی قبول نہیں کرتے، تو انہیں آگاہ کر دے کہ ان کی روش انہیں ایسی تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے جس کی شعلہ سامانیاں سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیگی۔

(۱۵) اس تباہی کے جہنم میں وہی گرتا ہے جو ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کرتا ہے۔

(۱۶) یعنی جو ان قوانین کی تکذیب کر کے، گریز کی راہیں نکالتا رہتا ہے۔

(۱۷) لیکن جو ہمارے قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ اس تباہی سے دور رکھا جاتا ہے۔

(۱۸) یعنی وہ جو عندالضرورت اپنا سب کچھ (ما۔ لہٗ) نوعِ انسان کی نشو و نما کے لئے دے دیتا ہے اور اس طرح خود اس کی اپنی ذات کی بھی نشو و نما ہوجاتی ہے۔

(۱۹) وہ جو کچھ دیتا ہے، اس لئے نہیں کہ اس پر کسی کا احسان تھا اور وہ اب اُس احسان کا بدلہ اُتار رہا ہے۔ بالکل نہیں۔ (۹۲/۱۹)

(۲۰) وہ اسے صرف خدا کے متعین کردہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے صرف کرتا ہے۔

(۲۱) اس سے اس کی محنت اور کوشش صحیح نتائج سے ہم آغوش ہوجاتی ہے۔ یہی اس کا بہترین صلہ ہے جس سے اُسے حقیقی مسرت حاصل ہوجاتی ہے۔

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن

طلوعِ اسلام کنونشن اپنے روایتی وقار و سنجیدگی اور شادابی و رعنائی کیساتھ
پرویز صاحب کے مکان۔ واقعہ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور پر
مورخہ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲ نومبر۔ بروز جمعہ۔ ہفتہ۔ اتوار منعقد ہوگی۔ کنونشن کے کچھ اجلاس خصوصی ہونگے۔
جن میں صرف ارکانِ بزم شریک ہو سکینگے لیکن باقی اجلاس کھلے ہونگے جن میں تمام حضرات شرکت فرما سکیں گے۔
اس شرکت کے لئے کسی پاس یا دعوت نامہ کی ضرورت نہیں!

(کھلے اجلاس کا مشروط) پروگرام حسبِ ذیل ہوگا

پہلا اجلاس:۔ ۱۰ نومبر۔ بروز جمعہ۔ ۲½ بجے سہ پہر — مقالہ پرویز صاحب — بعنوان
"احادیث" کا صحیح ترین مجموعہ!
(جس کے ایک لفظ میں بھی کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا)

دوسرا اجلاس:۔ ۱۰ نومبر۔ بروز جمعہ۔ چھ بجے شام — لیکچر ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب۔
"تخلیقِ انسانی" — سائنس اور قرآن مجید کی رو سے۔ (میجک لینٹرن کی روشنی میں)

تیسرا اجلاس:۔ ۱۱ نومبر بروز ہفتہ۔ ۲½ بجے سہ پہر۔ مذاکرہ جس میں پروفیسرز طلبا اور طالبات وغیرہ حصہ لینگے۔
عنوان — "آثار بتلاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی" — (بعض مقالے انگریزی میں بھی ہونگے)

چوتھا اجلاس:۔ ۱۱ نومبر۔ بروز ہفتہ۔ ۷½ بجے شب۔
مجلسِ استفسارات۔ (پرویز صاحب آپکے سوالات کے جوابات قرآن کی روشنی میں دینگے)
(سوالات پہلے بھیج دیجئے)۔

پانچواں اجلاس:۔ ۱۲ نومبر۔ اتوار۔ ۱۰ بجے صبح۔ مقالہ پرویز صاحب بعنوان
"انسانیت کا آخری سہارا"
(اقوامِ عالم جن مشکلات میں گرفتار ہیں۔ ان کا واحد حل)

ان اجلاس میں آپ کی شرکت ہمارے لئے باعثِ مسرت اور آپ کیلئے موجبِ نفع بخش ہوگی۔ یہ اجلاس پبلک جلسے نہیں بلکہ ایک طرح کی نہایت سنجیدہ، اور باوقار علمی محفلیں ہوتی ہیں جن میں آدابِ مجلس اور آئین نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

(مرزا) **محمد خلیل**۔ صدر مجلس طلوعِ اسلام کنونشن

کنونشن کے سٹال پر

آپ کو

علاوہ دیگر کتابوں کے حسبِ ذیل تازہ ترین کتابیں بھی مل سکیں گی!

۱۔ جہاد — اسلام کے اہم ترین اور اسکے ساتھ ہی نازک ترین موضوع پر مختصر، لیکن جامع کتاب۔ قیمت صرف دو روپے۔

۲۔ پاکستان کا معمارِ اوّل — ہماری نئی نسل سرسید کے عظمتِ مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سامنے لائی گئی ہے۔ قیمت ۔ تین روپے۔

۳۔ خدا اور سرمایہ دار — موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور، عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اسے بجا طور پر عہد آفریں تالیف کہا جا سکتا ہے۔

قیمت قسم اعلیٰ ۔ سفید کاغذ ۔ مجلد ۔ نو روپے ۔ قیمت ۔ قسم دوم ۔ نیوز پرنٹ ۔ پانچ روپے۔

۴۔ عربی خود سیکھئے — اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے کہیں آگے چلا گیا ہے۔ اس میں قریب سو صفحات پر مشتمل ایسے گوشوارے ہیں جو پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں تھے۔ کتاب کی ضخامت قریب ساڑھے تین سو صفحات تک پہنچ گئی ہے۔

قیمت فی جلد ۔ ساڑھے چار روپے۔

۵۔ قرآنی قوانین — ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ، وکلا حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی۔ پاکستان میں قوانین سازی کے مسئلہ میں اس سے بڑی مدد مل سکیگی۔ یہ کتاب پریس میں جا رہی ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ کنونشن تک تیار ہو جائیگی۔

ناظم ۔ ادارہ طلوعِ اسلام

اسے ضرور پڑھئے

حسب ذیل فہرست میں سے جو کتابیں آپ منگوانا چاہتے ہوں ان پر یہ نشان (✓) لگا دیں اور ٹکٹ چسپاں کئے بغیر یہ کارڈ حوالۂ ڈاک کر دیں اور کتابوں کی مجموعی قیمت میں سے کم از کم ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر یا بصورت ڈاک ٹکٹ بھیج دیں۔ آپ کو بقایا قیمت اور محصول ڈاک کا وی۔ پی آ جائے گا۔ لیکن اگر آپ کتابوں کی کل قیمت منی آرڈر کر دیں تو دس روپے یا اس سے زیادہ قیمت کے آرڈر کے لئے ڈاک خرچ (بذریعہ رجسٹرڈ پارسل) ہم اپنی طرف سے ادا کر دیں گے۔

اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ) ۸ روپے
اسلام کیا ہے؟ (سستا) ۴ "
سلسبیل ۸ "
قرآنی فیصلے (جلد اول) ۵ ۳/۲ "
قرآنی فیصلے (جلد دوم) ۵ ۳/۲ "
قرآنی فیصلے (جلد سوم) ۳ "
انسان نے کیا سوچا؟ ۱۲ "
من و یزدان ۱۰ "
ابلیس و آدم ۸ "
شعلۂ مستور ۶ "
نظام ربوبیت ۴ "
بہار نو ۵ "
مقام حدیث ۴ "
عربی خود سیکھئے ۲/۵۰ "

سلیم کے نام خطوط (جلد اول) ۸ روپے
" " (جلد دوم) ۶ "
" " (جلد سوم) ۶ "
الفتنۃ الکبریٰ ۶ "
فجر الاسلام ۸ "
لغات القرآن (جلد اول) ۱۵ "
" (جلد دوم) ۱۵ "
" (جلد سوم) ۱۵ "
" (جلد چہارم) ۱۲ "
" (پورا سیٹ) ۵۰ "
اسلامی معاشرت ۲ "
اسباب زوال امت ۱/۵۰ "
مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں
اعلیٰ ۵ روپے، سستا ۳ "

نام و پورا پتہ ....
....
....

خدا اور سرمایہ دار

ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا پیشکش

- کیا اسلام مغرب کے معاشی نظام کا حامی ہے ——— ؟
- کیا اسلام، اشتراکی نظام کا حامی ہے ——— ؟
- کیا اسلام کا کوئی اپنا معاشی نظام ہے ——— ؟
- اس نظام کی تفاصیل کیا ہیں ——— ؟
- وہ کس طرح دوسرے معاشی نظاموں سے مختلف ہے ——— ؟
- کیا وہ نظام، نوع انسان کے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کرسکتا ہے ——— ؟
- اس نظام کی مخالفت کس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور کیوں؟

یہ، اور اسی قسم کے دیگر معاشی مسائل کا تجزیہ، تبصرہ اور حل۔ عصر حاضر کے پریشاں انسان کے لئے شعاعِ امید۔ اہلِ پاکستان کیلئے قندیلِ راہ۔

قسم اعلیٰ — سفید پرنٹنگ پیپر۔ نہایت روشن طباعت۔ مضبوط جلد۔ حسین گردپوش۔
قیمت — نو روپے
سستا ایڈیشن — نیوزپرنٹ بکس بورڈ کور — قیمت — پانچ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/ بی - گلبرگ - لاہور